تعلیم و تربیت
ستمبر 2015

تعلیم و تربیت

ستمبر 2015ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! پرانے زمانے کی بات ہے کہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ایسی جگہ سے گزر رہا تھا جہاں کھجور کے تین درخت اُگے ہوئے تھے۔ کھجور کے ان تین درختوں میں دو پھل دار تھے اور ایک خشک تھا۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ نے کچھ دیر کے لیے ان درختوں کے نیچے سستانے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے دیکھا کہ ایک چڑیا خشک درخت سے اُڑ کر پھل دار درخت پر جاتی ہے اور پھر واپس خشک درخت پر آ جاتی ہے۔ چڑیا نے ان درختوں کے درمیان کئی چکر لگائے۔ ڈاکوؤں کے سردار کو چڑیا کی اس حرکت پر تشویش ہوئی اور تجسس کے لیے کھجور کے خشک درخت پر چڑھا۔ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر سردار نے دیکھا کہ ایک نابینا سانپ منہ کھولے شاخ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے اور چڑیا اس کے کھلے منہ میں آ کر خوراک ڈالتی ہے۔ ڈاکوؤں کا سردار چڑیا کی یہ حرکت دیکھ کر حیران رہ گیا اور سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے ایک موذی جانور کے رزق کے لیے چڑیا کو منتخب کیا ہے لیکن میں تو انسان ہو کر لوگوں کا مال لوٹ کر اپنا پیٹ پالتا ہوں جب کہ میں اشرف المخلوقات بھی ہوں۔ اس نے خود سے سوال کیا کہ کیا میرے لیے ڈاکہ زنی کرنا مناسب ہے؟ جب ڈاکوؤں کا سردار یہ بات سوچ رہا تھا تو غیب سے آواز آئی: ''میری رحمت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اب بھی توبہ کر لو تو میں قبول کر لوں گا۔''

سردار نے جب یہ آواز سنی تو پریشانی اور ندامت سے رونے لگا۔ وہ اسی وقت درخت سے نیچے اترا۔ غصے سے تلوار توڑ دی اور اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہو کر التجا کی: ''الٰہی! میری توبہ قبول فرما لے۔'' غیب سے آواز آئی: ''ہم نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔''

سردار کے ساتھیوں نے جب اسے اس حالت میں دیکھا تو پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ ڈاکوؤں کے سردار نے انہیں ساری کہانی سناری اور کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے۔ میں اس برے پیشے سے باز آیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ رازق اور مسبب الاسباب ہے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی سچے دل سے توبہ کر لی اور حج کرنے کی نیت سے سارے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ تقریباً تین دن کی مسافت کے بعد جب وہ ایک گاؤں میں پہنچے تو وہاں انہوں نے ایک نابینا بڑھیا کو دیکھا جو اس سردار کا نام لے کر پوچھ رہی تھی کہ اس جماعت میں وہ بھی ہے۔ ڈاکوؤں کا سردار آگے بڑھا اور نابینا بڑھیا سے کہنے لگا: ''ہاں! اے بڑھیا..... وہ میں ہوں۔ آپ بتائیں، کیا بات ہے؟'' وہ بڑھیا اٹھ کر کمرے میں گئی اور اندر سے کپڑے نکال کر لائی۔ بڑھیا نے بتایا کہ چند دن پہلے میرا بیٹا فوت ہو گیا ہے۔ یہ اس کے کپڑے ہیں۔ مجھے مسلسل تین راتوں سے نبی اکرم ﷺ کی بشارت ہو رہی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے خواب میں تشریف لا کر آپ کا نام لے کر ارشاد فرمایا ہے کہ وہ آ رہا ہے، یہ کپڑے اسے دے دینا۔ لہٰذا آپ اپنی امانت مجھ سے لے لیں۔ ڈاکوؤں کا سردار بڑھیا کی یہ بات سن کر وجد کی کیفیت میں آ گیا اور وہ کپڑے پہن کر مکہ مکرمہ حاضر ہوا۔ ڈاکوؤں کے اس سردار کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔

پیارے بچو! بحیثیت مسلمان ہمیں اپنے رزق کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے ہمت اور کوشش کرنی چاہیے کیوں کہ اللہ تعالیٰ بہترین رازق ہے۔ ہمیں اپنا رزق ہرگز حرام اور ناجائز طریقے سے نہیں کمانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو نیکی کی ہدایت دے تو وہ برائیوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اللہ کی نیک راہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

اس ماہ کے شمارے میں یوم وفات قائداعظم اور یوم دفاع کے سلسلے میں مضامین بھی شامل ہیں۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں میں یاد رکھیے گا۔ اب اجازت!

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

سرورق ''یوم دفاع''

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=850 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے۔

حمد باری تعالیٰ
تری ذات پاک ہے اے خدا ، تری شان جلّ جلالہٗ
تیرا نام مالکِ دوسرا ، تری شان جلّ جلالہٗ
جسے چاہے مُردہ بنائے تُو ، جسے چاہے زندہ اُٹھائے تُو
تیرے ہاتھ میں ہے فنا بقا ، تری شان جلّ جلالہٗ
کوئی شاہ کوئی امیر ہے ، کوئی بے نوا و فقیر ہے
جسے چاہے جیسا بنا دیا ، تری شان جلّ جلالہٗ
تُو خدا امیر و غریب کا ، تُو سہارا شاہ و فقیر کا
تُو ہے ساری دُنیا کا آسرا ، تری شان جلّ جلالہٗ
ہے ہر اک چمن میں تو رنگ و بُو ، ہے زباں پہ طوطی کی تُو ہی تُو
پڑھے کیوں نہ بلبلِ خوش نوا ، تیری شان جلّ جلالہٗ
نعت رسولِ مقبول ﷺ
درِ نبی پر پڑا ہوا ہوں پڑے ہی رہنے سے کام ہو گا
کبھی تو قسمت پھرے گی میری کبھی تو میرا سلام ہو گا
شفیعِ محشر لقب ہے اس کا اسے شفاعت سے کام ہو گا
ہے سب کا دار و مدار اس پر وہی مدار المہام ہو گا
اسی توقع پہ جی رہا ہوں یہی تمنا جلا رہی ہے
نگاہِ لطف و کرم نہ ہو گی تو مجھ کو جینا حرام ہو گا
کئے ہی جاؤں گا عرضِ مطلب ، ملے گا جب تک نہ مطلبِ دل
نہ شامِ مطلب کی صبح ہو گی نہ یہ فسانہ تمام ہو گا
یہاں نہ مقصد ملا تو کیا ہے وہاں ملے گا طفیلِ حضرتؐ
سنا ہے محشر میں اپنی امت پہ آپؐ کا فیض عام ہو گا
2015

حدیث شریف میں آتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر قائم ہے:
(1) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، (2) نماز قائم کرنا، (3) زکوٰۃ دینا، (4) رمضان کے روزے رکھنا، (5) بیت اللہ کا حج کرنا، ان کے لیے جو وہاں پہنچ سکتے ہوں۔''
(بخاری، کتاب الایمان: 8، مسلم، کتاب الایمان: 16)

پیارے بچو!

کلمہ، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج...... ان پانچ اعمال کو ''ارکانِ اسلام'' کہا جاتا ہے۔ ارکانِ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام کے بنیادی فرائض ہیں اور ان پر اچھی طرح عمل کرنے سے اسلام کے باقی احکام پر عمل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان ارکان میں نماز اور روزہ جسمانی عبادتیں ہیں، زکوٰۃ و صدقات مالی عبادتیں ہیں، جب کہ حج مالی عبادت بھی ہے اور جسمانی عبادت بھی یعنی اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور مشقت بھی اُٹھانی پڑتی ہے۔

قرآنِ پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے۔ اور اگر کوئی انکار کرے تو اللہ دُنیا جہان کے تمام لوگوں سے بے نیاز ہے۔'' (آلِ عمران: 97)

اس آیت میں حج کے فرض ہونے کا اعلان فرمایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتلایا گیا ہے کہ حج صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو وہاں پہنچنے کی حیثیت اور طاقت رکھتے ہوں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حج کرنے کی استطاعت اور قوت دی ہو اور وہ ناشکری سے حج نہ کریں تو ان کے حج نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگڑے گا، بلکہ اس ناشکری کی وجہ سے صاحبِ استطاعت خود ہی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں، عنایتوں اور نوازشوں سے محروم ہو جائیں گے اور فرض چھوڑنے کا گناہ الگ سے ہوگا۔

احادیث مبارکہ میں حج اور حاجیوں کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں۔

☆......حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''حج اور عمرہ کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے خاص مہمان ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرماتا ہے اور مغفرت مانگیں تو ان کو بخش دیتا ہے۔''
(ابن ماجہ، کتاب المناسک، 2892)

☆......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''یکے بعد دیگرے حج و عمرہ ادا کرو کیوں کہ وہ دونوں تنگ دستی اور گناہوں کو اس طرح دُور کر دیتے ہیں جس طرح آگ کی بھٹی لوہے اور چاندی، سونے کے میل کچیل کو دُور کر دیتی ہے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہی ہے۔''
(ترمذی، ابواب الحج 810)

حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جس میں گناہ نہ کیے ہو اور جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی مقصود ہو، دکھلاوا مقصود نہ ہو۔ یاد رکھیے! نیکی کا جو کام بھی دکھلاوے، شہرت یا کسی غلط نیت و ارادہ سے ادا کیا جائے وہ اپنا اجر و ثواب کھو دیتا ہے۔ اجر و ثواب اس نیک عمل پر ملتا ہے جو اچھی نیت سے ادا کیا جائے اور جس میں رب تعالیٰ کو راضی کرنا مطلوب ہو۔

پس مذکورہ دو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاؤں کی قبولیت، گناہوں کی معافی، اللہ تعالیٰ کی خاص مہمانی، رزق کی فراخی اور کشادگی، یہ وہ فضیلتیں ہیں جو حج کی برکت سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو حج میں ایک مزید نعمت اور عظیم دولت یہ بھی ہے کہ حاجی جب ان مقدس مقامات کی زیارت کرتا ہے تو اس کا ایمان بھی تازہ ہو جاتا ہے۔

پیارے بچو!

آیئے! ہم سب دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے یہ روحانی لذتیں اور دولتیں ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین!

......☆......

خودداری

"بوٹ پالش!...... بوٹ پالش!"

شہر کے ایک نہایت ہی مصروف چوک سے مسلسل یہی آواز آ رہی تھی۔ کونے میں بیٹھے مزمل کی آواز کی طرف کوئی بھی کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے جب کہ ٹریفک بھی رواں دواں تھی اور آج گرمی کی شدت بھی تھی، ایسے میں ہر بندہ بس اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔ اس گرم دوپہر میں مزمل بے چارہ ایک کونے میں بیٹھا ہر آنے جانے والے راہ گیر کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد 'بوٹ پالش...... بوٹ پالش' کی آواز دے رہا تھا تاکہ کوئی گاہک اس سے اپنے بوٹ پالش کروا لے لیکن گاہک تھے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ایک تو گرمی اوپر سے رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ چل رہا تھا۔ سو ہر کوئی گرمی سے بچنے کی کوشش میں تھا۔ اتنی سخت گرمی میں بھی مزمل نے روزہ رکھا ہوا تھا اور اپنا کام بھی جاری رکھا ہوا تھا۔

مزمل جب آٹھ سال کا تھا تو اس کے ابو انتقال کر گئے، اس لیے بوڑھی ماں اور ایک چھوٹی بہن کی ذمہ داری اب اس کے ننھے منے کندھوں پر تھی۔ ان کا کوئی رشتے دار بھی تو نہیں تھا جو ان کی کفالت کر سکے۔ یہی وجہ تھی جو مزمل نے اپنی پڑھائی درمیان میں ہی ادھوری چھوڑ دی اور چھوٹی ہی عمر میں محنت مزدوری کر کے اپنے گھر کا خرچہ چلانے لگا۔ مزمل ایک شریف اور نہایت نیک لڑکا تھا جو مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنے پڑوسیوں کے کام آتا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اپنی پڑھائی چھوٹ جانے کی وجہ سے بہت افسردہ تھا لیکن حالات کے آگے مجبور تھا۔ پھر بھی وہ ہر وقت صبر و شکر سے کام لیتا تھا۔ ایسے سخت اور کٹھن حالات میں بھی مزمل صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں تھا۔ اس کے مطابق ایک دن خدا اپنے فضل و کرم سے ان کے حالات ضرور بدلیں گے۔ مزمل نے محنت سے کبھی عار محسوس نہیں کی، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر چھوٹا بڑا کام نہایت خندہ پیشانی سے کر لیتا تھا۔ وہ صبح سویرے پالش کا چھوٹا سا بکس اُٹھائے شہر کے مشہور چوک پر جاتا اور پورا دن لوگوں کے بوٹ پالش کرتا جس سے وہ اتنے پیسے کما لیتا تھا جس سے اس کے گھر کا خرچہ بڑی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ وہ شام کو جب تھکا ہارا واپس آتا تھا، تب وہ اپنی ماں کی دعائیں لیتا تھا جس سے اس کی پورے دن کی تھکن دُور ہو جاتی تھی اور روکھی سوکھی کھا کر خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ غربت کے باوجود بھی مزمل اپنی حیثیت کے مطابق غریب اور نادار لوگوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے اس کی پڑوس والی ایک بوڑھی عورت نے اسے کچھ رقم دی اور بازار

سے اپنا چشمہ ٹھیک کروانے کو کہا۔ جب مزمل نے چشمہ ٹھیک کروا کے دُکان دار کو بل ادا کیا تو پیسے تو کم پڑ گئے لیکن مزمل نے اپنی جیب سے بقیہ رقم ادا کی اور خاموشی سے واپس آ کر اس بوڑھی عورت کو چشمہ دے دیا۔

ایک دن جب وہ کام سے واپس آیا تو اس کی ماں نے کہا: ''بیٹا! کب تک یونہی مزدوری کرتے رہو گے؟ آپ نے اپنی پڑھائی بھی تو ادھوری چھوڑی ہوئی ہے......؟''

مزمل نے کہا: ''امی، آپ تو جانتی ہی ہیں کہ میں جتنا کما پاتا ہوں وہ تو گھر کے خرچے کے لیے بھی ناکافی ہے، اوپر سے میں پڑھائی کا خرچہ کہاں سے لاؤں گا۔''

اس کی امی نے کہا: ''بیٹا! ہمارے شہر میں بہت سی ایسی تنظیمیں اور گورنمنٹ کے فلاحی ادارے موجود ہیں جو پڑھائی کے لیے غریب اور نادار بچوں کی مدد کرتے ہیں، آپ ان سے کیوں نہیں رابطہ کرتے؟''

بیٹے نے ماں کو جواب دیا: ''امی آپ بھی بہت بھولی ہیں...... بیشک یہ ادارے مدد کرتے ہوں گے لیکن آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میں شروع سے ہی کسی سے سوال کرنے یا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے خلاف ہوں...... آپ فکر نہ کریں، خدا سب ٹھیک کر دے گا۔''

مزمل کی امی نے کہا: ''بیٹا! فکر کیوں نہ کروں، آخر تمہاری ماں ہوں اور ہمیں اپنی گڑیا کے بارے میں بھی تو سوچنا ہے، آج یہ چھوٹی تو کل بڑی ہو جائے گی۔ ہمیں ابھی سے ہی اس کی تعلیم و تربیت اور شادی کے بارے میں سوچنا پڑے گا، آخر یہ سب کیسے ہوگا؟''

''امی آپ ابھی سے ہی یہ سوچنے کیوں لگی ہیں؟ میری بہن گڑیا ابھی بہت چھوٹی ہے، جب وہ پڑھائی کے لائق ہو جائے گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ دن رات ایک کر کے بھی اس کو پڑھائی کے زیور سے آراستہ کروں گا۔'' مزمل نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

مزمل کی امی نے کہا: ''بیٹا! اس کو تو آپ پڑھائیں گے لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی اپنی ادھوری پڑھائی پھر سے شروع کریں۔''

مزمل نے ماں کی تائید کرتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے امی! جوں ہی کچھ رقم بچے گی تو میں اسکول ضرور جاؤں گا۔ اب خوش؟''

مزمل کی امی نے خوش ہو کر اس کو دعائیں دیں اور تھوڑی دیر بعد سب سو گئے۔

آج مزمل کے پاس گاہکوں کا بڑا رش تھا کہ اچانک ایک کار آ کر اس کے پاس رکی۔ ایک سیٹھ کار میں سے اترا اور سیدھا مزمل کے پاس آیا: ''لڑکے جلدی سے میرے بوٹ پالش کر دو۔''

مزمل نے بھی جلدی جلدی سے اس کے بوٹ چمکا دیے تو سیٹھ نے بٹوے میں سے رقم نکال کر مزمل کو ہاتھ میں دینے کے بجائے نیچے زمین پر پھینک دی اور بڑے غرور سے بولا: ''اٹھاؤ اپنی مزدوری۔''

مزمل دبے لہجے میں بولا: ''سیٹھ میں نیچے پھینکی ہوئی چیزیں نہیں اٹھاتا...... اگر آپ نے مزدوری دینی ہے تو عزت سے ہاتھ میں کیوں نہیں دیتے؟ شاید آپ نے یہ حدیث نہیں سنی کہ 'مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے۔' اور 'مزدور خدا کا دوست ہوتا ہے۔' سیٹھ ہماری بھی کوئی عزت ہے، کیا ہوا جو ہم غریب ہیں؟ کل کو اگر وقت اور حالات نے آپ کو بھی غریب بنا دیا تو سوچو آپ یہ رویہ برداشت کر سکیں گے؟''

مزمل کہتا گیا اور وہ سیٹھ خاموشی سے سنتا گیا۔ سیٹھ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے وہ رقم زمین سے اٹھائی اور مزمل کو دیتے ہوئے کہا: ''بیٹا! آپ نے مجھے غلطی کا احساس دلایا اس لیے میں آپ کا مشکور ہوں اور اپنے مغرور رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ خدا بھی مجھے معاف کرے گا، میں اب کبھی بھی غرور اور تکبر نہیں کروں گا۔''

''سیٹھ صاحب! غلطی کا احساس ہی اس کی سزا ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔'' یہ کہہ کر مزمل نے اس سے پیسے لیے اور اپنے کام میں لگ گیا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مزمل کو اپنی بہن گڑیا کی پڑھائی اور والدہ کی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں کافی فکر ہونے لگی تھی۔ اب تو اس نے رات کو بھی کام پر جانا شروع کر دیا تھا لیکن ان کے حالات نہیں بدلے۔

ایک دن مزمل کے پاس ایک اجنبی شخص آیا، وہ کافی جلدی میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مزمل سے کہا: ''بیٹا! جلدی سے میرے بوٹ پالش کر دو۔'' مزمل نے بھی دیر نہیں لگائی اور جلدی سے بوٹ پالش کر کے اس کو دیے۔ اس اجنبی نے جب اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف کریڈٹ کارڈ پڑا تھا اور کھلے پیسے اس کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے۔ ''بیٹا! اس وقت تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں جلدی میں ہوں۔ تم اس طرح کرو کہ یہ پرانا پرائز بانڈ رکھ

لو۔ میری تو قسمت میں انعام نہیں نکلا، البتہ اگر تمہاری قسمت میں ہوا تو یہ ضرور نکلے گا۔" اس اجنبی شخص نے جب وہ انعامی پرائز بانڈ مزمل کے حوالے کرنا چاہا، تب مزمل نے وہ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا: "کوئی بات نہیں، صاحب جی! آپ اگلی مرتبہ پیسے دے دینا۔" وہ اجنبی بولا: "بیٹا! میں اس شہر میں اجنبی ہوں اور اپنا ضروری کام نپٹا کے میں واپس اپنے شہر چلا جاؤں گا۔ اس لیے یہ انعامی پرائز بانڈ میں اپنی رضامندی سے آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ اسے خیرات نہیں بلکہ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔" اس اجنبی کے بے حد اصرار پر مزمل نے وہ پرائز بانڈ اپنے پاس رکھ لیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اجنبی کہیں بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا، ایک دن حسبِ معمول جب مزمل اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک اخبار فروش کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ آج کی اخبار میں پرائز بانڈ کی قرعہ اندازی ہے، اخبار لے لو۔ تب مزمل کے ذہن میں خیال آیا کہ اس کے پاس بھی تو اس اجنبی کا دیا ہوا ایک پرائز بانڈ پڑا ہے، سو اس نے وہ پرائز بانڈ اپنے پالش والے بکس سے نکالا اور اخبار فروش سے کہا: "بھائی! یہ میرا نمبر بھی چیک کر کے دو۔ اخبار فروش نے اس سے پرائز بانڈ لیا اور اس کا نمبر اخبار میں تلاش کرنے لگا اور پھر وہ زور سے چلایا۔ "لڑکے! مبارک ہو...... مبارک ہو، آپ کا پچاس لاکھ روپے کا انعام نکلا ہے۔" یہ سنتے ہی مزمل کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس اجنبی کو یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا۔ "کاش! وہ اجنبی مجھے کہیں مل جاتا تو اس کی رقم واپس کر دیتا۔" وہ یہ سوچتے سوچتے اپنے محلے کی مسجد کے قاری صاحب کے پاس آیا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ قاری صاحب نے اس سے کہا کہ اگر اس اجنبی شخص نے اپنی رضامندی اور اپنی خوشی سے وہ پرائز بانڈ آپ کو دیا تھا تو وہ آپ کے لیے جائز ہے اور وہ رقم آپ استعمال کر سکتے ہو۔ قاری صاحب کے سمجھانے پر مزمل کافی مطمئن ہو گیا اور وہ سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ جب اپنی امی اور بہن کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔

آج مزمل کا شمار شہر کے چند جانے پہچانے مال دار لوگوں میں سے ہوتا تھا۔ مزمل کا کاروبار پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کی والدہ کا علاج شہر کے ایک اچھے اسپتال میں ہو رہا تھا جب کہ اس کی بہن گڑیا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک فلاحی اسپتال میں بطور ڈاکٹر کام کر رہی تھی۔ باقی مزمل بھی گریجوایشن کر کے اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ گاڑی، بنگلہ، نوکر چاکر یعنی خدا نے انہیں ہر نعمت سے نوازا تھا۔ مزمل نے شادی بھی کر لی تھی اور اپنی زندگی فلاحی کاموں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس نے یتیم اور غریب بچوں کے لیے اسکول اور ہاسٹل بھی کھول رکھے تھے جہاں انہیں مفت تعلیم و تربیت کے ساتھ رہائش بھی دی جاتی تھی۔ مزمل باقاعدگی کے ساتھ ٹیکس بھی ادا کر کے ایک معزز شہری ہونے کا حق ادا کرتا تھا۔ اتنی ساری دولت کے باوجود بھی مزمل اپنا پُرانا وقت کبھی نہیں بھولا۔ وہ رات کو روزانہ اپنا پرانا پالش والا بکس کھول کے دیکھتا تھا جو ابھی تک اس نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور پھر سوچ میں ڈوب جاتا تھا اور آبدیدہ ہو کر خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی بیگم نے پوچھ ہی لیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے جواب دیا: "بیگم! انسان کو اپنی حیثیت کبھی بھی نہیں بھولنی چاہیے۔ میں اس پالش کے بکس میں اپنی غربت ڈھونڈتا ہوں تاکہ دولت کے نشے میں مَیں کہیں مغرور نہ ہو جاؤں۔ اس طرح کرنے سے مجھے سکون ملتا ہے اور میں اپنے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے ابھی تک اپنی حیثیت نہیں بھلائی۔"

بچو! ہمیں بھی ہر کام محنت اور ایمان داری سے کرنا چاہیے اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے جب کہ اپنی زندگی خودداری سے بسر کرنی چاہیے، یہی سبق ہے اس کہانی کا۔ ☆☆☆

گل دوپہر، بارہ بجیا

یہ نازک قسم کا موٹی پھول ہے جسے عام طور پر گلفند کہتے ہیں۔ کھلی آب و ہوا میں نشوونما پاتا ہے۔ "جہاں چاہو بو دو اُگ آئے گا" کا جملہ اس پر صادق آتا ہے۔ اس کا بیج مئی سے جولائی میں بویا جاتا ہے۔ جولائی سے اکتوبر تک اس کی بہار ہوتی ہے۔ اس کے پودے قلموں اور پود سے تیار کیے جاتے ہیں۔ جس کی اونچائی چھ انچ ہوتی ہے۔ اس کے پھول کٹورا نما ہوتے ہیں جو سورج چڑھنے پر کھلتے ہیں اور سورج چھپنے پر بند ہو جاتے ہیں۔ برسات سے پیشتر ان کی رونق زوروں پر ہوتی ہے۔

کمال احمد کا تعلق ایک سفید پوش طبقے سے تھا۔ انہیں علم سے بڑی محبت تھی۔ خود وہ صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکے۔ ان کا دل تو کالج جانے کو بھی بہت مچلتا تھا مگر اپنے والد کے اصرار پر کہ بیٹا! اب تم بڑے ہو گئے ہو اور میں بوڑھا، مجھ سے اب یہ مشقت بھری مزدوری نہیں ہوتی۔ اب تم کہیں کوئی نوکری کرو تا کہ ہم باپ بیٹے کا آسانی سے گزارا ہو سکے۔ کمال احمد جانتے تھے کہ دس جماعتیں پاس کر لینا اس دور میں اچھی نوکری کے حصول کے لیے ناکافی ہیں مگر پھر والد کا روز روز کا اصرار دیکھ کر انہوں نے ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ ملازمت سے ملنے والی اجرت اتنی ہی تھی جتنی بابا کی مزدوری، فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے بابا مزدوری کرتا تھا اور اب کمال احمد کمانے لگا تھا۔ بیٹے کی نوکری لگنے کے چند ماہ بعد ہی بابا نے اپنے ہی جیسے غریب گھر میں بیٹے کمال احمد کی شادی کر دی کیوں کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ان باپ بیٹے کے کھانے پینے کا خیال رکھے۔ کمال احمد کی ماں چھ سال قبل انتقال کر چکی تھی۔ کمال احمد کی بیوی زلیخا بالکل اَن پڑھ اور جاہل عورت تھی مگر گھر کو سنبھالنے اور کام کاج میں ماہر تھی۔ بیٹے کی نوکری لگ جانے اور بہو کے گھر سنبھال لینے پر کمال احمد کے والد اللہ کے شکر گزار تھے کیوں کہ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق طے پا گیا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس گھرانے میں کمال احمد کی بیٹی کی صورت میں خوب صورت اضافہ ہوا۔ ننھی پری کا نام ثمرہ احمد رکھا گیا۔ ثمرہ کے دم سے گھر میں ایک رونق آ گئی۔ ماں باپ، دادا سب اسے دیکھ دیکھ کر جیتے۔ کمال احمد نے بیٹی کی پیدائش پر ہی سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو خوب زیورِ تعلیم سے آراستہ کرے گا۔ اس کے دل میں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کی حسرت رہ گئی ہے، وہ بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر پوری کرے گا۔ جب ثمرہ چار سال کی ہوئی اور کمال احمد نے اسے اسکول میں داخل کروانا چاہا تو پُرانے خیال کے حامل دادا اور جاہل ماں آڑے آ گئے۔ کمال احمد نے ان کی سوچ پر غصہ کرتے ہوئے عزم کے ساتھ کہا کہ میں اپنی بیٹی کو تعلیم ضرور دلواؤں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے تو جواباً بیوی بولی کہ یہ لڑکا ہوتا تو ٹھیک تھا مگر یہ تو لڑکی ہے۔ ''لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ لڑکا لڑکی دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں کوئی مجھے نہ روکے ٹوکے، میں اس مسئلے پر کسی کی ایک نہیں سنوں گا۔ کیا مطلب ہوا، لڑکی ہے تو جاہل رہے گی؟ حدیث شریف میں ہے کہ 'علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین تک ہی جانا پڑے۔' اس میں کہیں نہیں لکھا کہ صرف مرد تعلیم حاصل کریں۔'' پھر بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''جانتی ہو جب ہم ایک لڑکے کو تعلیم دلواتے ہیں تو صرف ایک فرد صاحب علم

ہوتا ہے مگر جب ایک لڑکی تعلیم یافتہ ہوتی ہے تو اس کی پوری نسل تعلیم یافتہ ہوتی ہے مگر میں کس سے کہہ رہا ہوں جو خود مطلق جاہل ہے۔'' پھر وہ باپ سے مخاطب ہو کر بولا: ''بابا! بچوں کی تعلیم کا فیصلہ صرف میرا ہوگا۔ اس معاملے میں میں کسی کی بھی کوئی رائے قبول نہیں کروں گا۔ میں آج اور ابھی ثمرہ کو اسکول داخل کروا کر آتا ہوں۔'' جس مہینے ثمرہ کا اسکول میں داخلہ ہوا، اسی مہینے اللہ نے اسے ایک اور بیٹی سے نوازا۔ کمال احمد نے دوسری بیٹی پا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور ننھی بیٹی کا نام ثمرہ سے ملا کر نمرہ رکھا مگر کمال احمد کے والد کچھ بجھے بجھے سے تھے شاید انہیں پوتے کی آرزو تھی لیکن بیٹے کی خوشی اور شکر گزاری دیکھ کر بولے کچھ نہیں۔

وقت بیتا، بہت سے ماہ و سال گزر گئے۔ کمال احمد کے والد اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ ثمرہ یونیورسٹی اور نمرہ کالج پہنچ گئیں۔ ایک دن ثمرہ کی والدہ زلیخا بی بی بہت پریشان تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس پانچ پانچ ہزار کے دس نوٹوں کی صورت کسی کی امانت لکڑی کی الماری کے ایک دراز میں عرصہ سے رکھی تھی۔ آج اچانک زلیخا نے دیکھا تو تمام نوٹ دیمک زدہ ہو چکے تھے۔ زلیخا نے پریشان ہو کر وہ نوٹ اپنے بھائی کو دکھا کر کہا کہ ان کا کوئی حل ہے؟ بھائی بھی بہن کی طرح اَن پڑھ جاہل تھا۔ کہنے لگا یہ نوٹ دیمک کھا چکی ہے اب ان کا کوئی حل نہیں، سوائے اس کے کہ انہیں کچرے کے ڈبے میں ڈال دو۔ بھلا دیمک زدہ نوٹوں کا کیا حل ہوسکتا ہے؟ بھائی کی حوصلہ شکن باتیں سننے کے بعد زلیخا بہت پریشان اور بجھی بجھی نظر آنے لگیں۔ وہ پریشان تھی کہ امانت کے پچاس ہزار کی رقم کہاں سے ادا کرے گی۔ ثمرہ نے ماں کی پریشان کن کیفیت محسوس کر کے خود ہی پوچھ لیا تو ماں نے اپنی پریشانی فوراً بیٹی کو بتا دی جسے سن کر ثمرہ نے دیمک زدہ نوٹ دیکھ کر ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ''شکر کیجیے، نوٹوں کے نمبر سلامت ہیں۔''

''نمبروں کے سلامت ہونے سے کیا ہوگا۔ نوٹ تو سب کے سب ناقابلِ استعمال ہو چکے ہیں۔'' زلیخا نے بیٹی کی پوری بات سنے بغیر تاسف سے کہا۔ نہیں ماں! یہ کوئی مسئلہ نہیں، بنک سے نوٹ تبدیل ہو جائیں گے۔'' ثمرہ نے ماں کو تسلی دی۔ دوسرے دن ثمرہ نے بنک جا کر منیجر کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے نوٹ تبدیل کرنے کی درخواست کی۔ بنک منیجر نے تمام نوٹ بڑی احتیاط سے چیک کیے اور ثمرہ کو بتایا کہ سوائے ایک نوٹ کے جو سب سے اوپر تھا، اس کا نمبر مکمل ختم ہو چکا ہے لہٰذا اس ایک نوٹ کو چھوڑ کر باقی نوٹ تبدیل ہو جائیں گے۔ کچھ ضروری کارروائی کے بعد منیجر صاحب نے ثمرہ کو نو نوٹ تبدیل کر کے دے دیے۔ ثمرہ نے منیجر کا بہت شکریہ ادا کیا اور گھر آ کر ماں کو نوٹ تبدیل ہو جانے کی خوش خبری سنائی۔ اس دن ثمرہ اور نمرہ کی والدہ کو احساس ہوا کہ ان کے شوہر کمال کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ تعلیم ہی کی بدولت انسان کو آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ آج ان کی تعلیم یافتہ بیٹی نے ان کی مشکل کتنی آسانی سے حل کر دی۔

کمال احمد اور زلیخا کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیوں کے علاوہ مزید کوئی اولاد عطا نہیں کی۔ بیٹا نہ ہونے کا انہیں کوئی غم یا گلہ نہیں تھا بلکہ کمال احمد اس بات پر رب تعالیٰ کے شکر گزار تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو رحمتوں سے نوازا ہے۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اپنے والد کمال احمد کی راہ نمائی میں ثمرہ اور نمرہ نے علم کی روشنی کو ننھے بچوں میں منتقل کرنے کے لیے چھوٹے پیمانے پر اسکول کی ابتدا کی جسے دونوں بہنوں نے اپنی محنت و لگن سے بڑھا کر میٹرک تک پہنچا دیا۔ علاقے میں عزت و وقار کے ساتھ علم کا نور بکھیرتا ان کا اسکول اپنا جدا مقام رکھتا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو کام یاب انسان کے روپ میں دیکھ کر ان کی والدہ زلیخا بھی نہایت مسرور ہے۔ انہیں اب اپنے رب سے بیٹا عطا نہ کرنے کا کوئی شکوہ نہیں رہا کہ ان کی بیٹیوں نے بیٹوں جیسا کام کر دکھایا تھا۔ ☆☆

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلْهَادِیُ جَلَّ جَلَالُہٗ
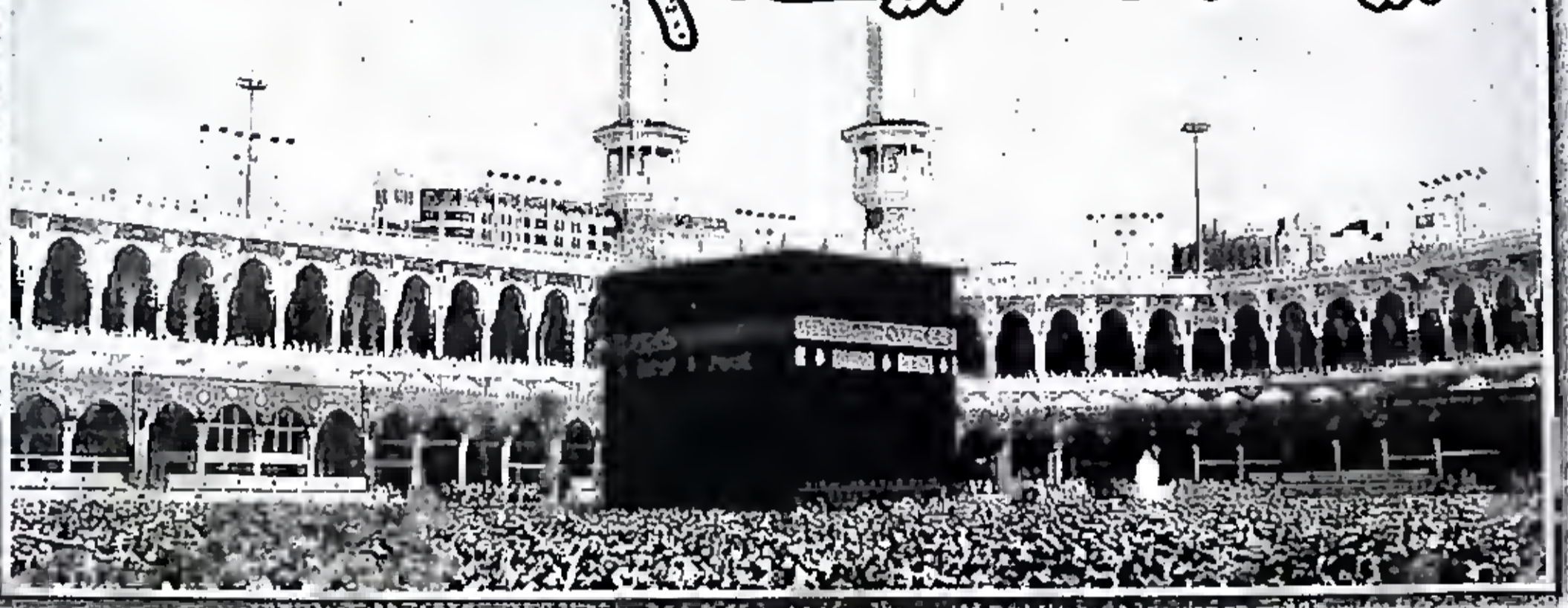
(سیدھا راستہ دکھانے والا اور اس پر چلانے والا)

اَلْهَادِیُ جَلَّ جَلَالُہٗ اپنے بندوں کو سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہر ایک کو ہدایت عطا فرماتا ہے۔ انسان اور جانوروں کو ہدایت دی کہ وہ اپنا رزق کیسے تلاش کریں۔ چوزہ انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنا سیکھ جاتا ہے۔ ہدایت اور سیدھا راستہ بہت بڑی دولت اور نعمت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی اسے ساری دُنیا کی بھلائی اور خیر مل گئی۔

ہر نماز میں

ہدایت کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ حاصل ہو جائے اس کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے جس میں ہم پڑھتے ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔''

ہم جب بھی یہ دعا مانگیں تو اس وقت یہ نیت کرلیں کہ اے اللہ! ساری دُنیا کے انسانوں کو ہدایت نصیب فرما۔

ہم لوگ دوسروں کی کس طرح رہ نمائی کر سکتے ہیں؟ وہ اس طرح کہ اگر کوئی مسافر ہے تو اسے راستہ بتا کر اس کی رہ نمائی کر دی...... کسی کو سڑک پار کروا دی۔ اگر خدانخواستہ کوئی دوست ایسے کاموں میں مبتلا ہے جو اچھے نہیں ہیں تو انہیں ہم دردی اور نرمی سے تنہائی میں سمجھانا کہ یہ کام اچھے نہیں ہیں اور اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دُعا کرنا۔

روشنی کا سفر

''کوئی ہے جو محمد (ﷺ) کو قتل کر دے۔'' کافروں کے سرداروں نے مشورہ میں پوچھا۔

''میں کروں گا۔'' عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کہا۔

''بے شک تم ہی کر سکتے ہو۔'' سب لوگوں نے مل کر کہا کیوں کہ یہ بہت بہادر تھے، کسی سے نہ ڈرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے حضور اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی کوششوں میں رہتے تھے۔

چناں چہ یہ تلوار لٹکائے اُٹھے اور اسی نیت پر عمل کرنے کے لیے چل دیے۔ راستے میں انہیں حضور ﷺ کے ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ملے۔

''عمر! کہاں جا رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قریش کے قبیلے کے لوگ تمہیں بھی بدلے میں قتل کر دیں گے۔'' اس بات پر انہیں غصہ آ گیا۔ ''معلوم ہوتا ہے تم بھی مسلمان ہو گئے

ہو۔ پہلے تم ہی کو قتل کر دوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے تلوار نکال لی۔
"ہاں! میں مسلمان ہو گیا ہوں۔" حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی تلوار سنبھال لی۔ دونوں طرف سے تلوار چلنے کو تھی۔
"پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔" حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ بس یہ سننا تھا کہ غصے سے بھر گئے اور سیدھے بہن کے گھر گئے۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن کریم کی تعلیم دے رہے تھے۔ وہ جلدی سے اندر چھپ گئے اور قرآن کریم کی آیت کا وہ ٹکڑا باہر رہ گیا۔ بہن نے دروازہ کھولا، انہوں نے بہن کے سر پر کوئی چیز ماری جس سے سر سے خون بہنے لگا۔ "اپنی جان کی دشمن! تو بھی مسلمان ہو گئی۔ کیا تم نے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لیا؟"

بہنوئی نے کہا: "اگر دوسرا دین حق ہو تب؟"

بس یہ سننا تھا کہ ان کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی اور زمین پر گرا کر خوب مارا۔ بہن نے چھڑانے کی کوشش کی تو ایک طمانچہ ان کے منہ پر بہت زور سے مارا کہ خون نکل آیا۔ آخر وہ بھی ان ہی کی طرح بہادر تھیں۔ کہنے لگیں: "عمر! ہم کو اس وجہ سے مارا جاتا ہے کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ بے شک ہم مسلمان ہو گئے جو تم سے ہو سکے کر لو۔"

اچانک ان کی نگاہ اس ورق پر پڑی جو جلدی سے باہر رہ گیا، بہن خون سے لت پت تھی انہیں شرم آنے لگی۔

"اچھا یہ دکھاؤ یہ کیا ہے۔"

بہن نے جواب دیا: "تم ناپاک ہو اور اس کو ناپاک ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت اصرار کیا مگر بہن نے انہیں بے وضو کی حالت میں دینے سے انکار کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہائے اور اس کاغذ کو لے کر پڑھا۔ اس میں یہ آیت لکھی تھی:

"اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِی۔"

"حقیقت یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس لیے میری عبادت کرو۔"

یہ پڑھنا ہی تھا کہ دل کی حالت بدل گئی۔ کہنے لگے:

"اچھا مجھے محمد ﷺ کی خدمت میں لے چلو۔"

یہ الفاظ سن کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ جو ان کی بہن اور بہنوئی کو تعلیم دے رہے تھے، وہ باہر تشریف لائے اور کہنے لگے:

"اے عمر! تمہیں خوش خبری ہو، کل جمعرات میں حضور ﷺ نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! عمر اور ابوجہل میں سے جو تجھے زیادہ پسند ہے اُن سے اسلام کو قوت عطا فرما۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی دعا تمہارے حق میں قبول ہو گئی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جمعہ کی صبح مسلمان ہوئے۔ ان کے مسلمان ہوتے ہی کافروں کے حوصلے کم زور ہونا شروع ہو گئے۔ پہلے مسلمان چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لاتے ہی مسلمان مکہ کی مسجد میں نماز پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت عطا فرما دے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"عمر (رضی اللہ عنہ) کا اسلام لانا مسلمانوں کی فتح تھی۔ ان کا ہجرت کرنا، مسلمانوں کی مدد تھی اور ان کا مسلمانوں کا خلیفہ بننا رحمت تھی۔"

چھینک، اللہ کی ایک رحمت

جب بھی چھینک آ جائے تو چھینکنے والا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے۔ سننے والا جواب میں "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہے جس کا ترجمہ ہے "اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے" یہ جواب دینا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔

پھر چھینکنے والا اسے یہ دُعا دے "یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ"

ترجمہ: "اللہ آپ کو ہدایت دے۔"

یہ دونوں دُنیا میں ہی دعائیں قبول ہو جائیں تو چھینکنے والے اور جواب دینے والے دونوں کو نفع ہی نفع مل جائے۔

یاد رکھنے کی باتیں

☆ جب بھی کسی کو چھینک آ جائے تو چھینکنے والا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے، سننے والا جواب میں "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہے اور پھر چھینکنے والا اسے ان الفاظ میں دُعا دے "یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ۔"

☆ جب بھی سورۂ فاتحہ میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پڑھیں، تو دل میں یہ نیت کر لیں کہ اے ہدایت دینے والے اللہ! ساری دُنیا کو سیدھے راستے پر چلا۔

☆☆☆

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دُنیا میں سب ہی آئے ہیں مرنے کے لیے

قیامِ پاکستان کی ابتداء میں کراچی پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔ اس وقت یہ شہر بہت صاف ستھرا اور چھوٹا ہوا کرتا تھا۔ 11 ستمبر کے دن جب قائداعظمؒ کا انتقال ہوا، لوگوں کے معمولاتِ زندگی میں ایک دم زبردست فرق آیا۔ صبح سویرے معمول کی آوازیں بند تھیں۔ اس وقت جب لوگوں کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دودھ والا، ڈبل روٹی والا اور دوسرے پھیری والے غیر حاضر تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اس دن اخبار میں قائداعظمؒ کے انتقال کی خبر سیاہ حاشیوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ یہ خبر سن کر لوگ سکتے میں آگئے اور جس کسی نے سنا وہ دیوانہ وار گھروں سے نکل پڑا۔ ان لوگوں نے گورنر ہاؤس کا رُخ کیا۔ گورنر ہاؤس کے باہر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ قائداعظمؒ کا جنازہ پورچ میں رکھا ہوا تھا۔ لوگ وائی ایم سی اے کے دروازے کی طرف سے داخل ہوئے اور جم خانہ گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ ہجوم جذبات سے بھرا ہوا تھا، ہر شخص کی آنکھ پُرنم تھی۔ قائداعظمؒ کی میت کفن میں لپٹی رکھی ہوئی تھی۔ چہرہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ قائداعظمؒ ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی میں لوگ ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لیے بے چین ہوتے تھے۔ آج بھی لوگ ان کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے مگر افسوس کے ان کے نقشِ قدم پر چلنے والا ایک بھی نہیں ہے۔

قائداعظمؒ جب زیارت میں قیام پذیر تھے تو سخت بیماری کی وجہ سے انہوں نے کھانا پینا کم کر دیا۔ معالج نے فاطمہ جناح کو تجویز پیش کی کہ قائداعظمؒ کو کھانے کی طرف راغب کرنے کے لیے ان کی پسند کا کھانا بنوایا جائے۔ محترمہ نے کہا کہ پاکستان بننے سے پہلے ممبئی میں ان کا ایک باورچی ہوا کرتا تھا جس کے بنے ہوئے کھانے قائداعظمؒ شوق سے کھاتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ باورچی فیصل آباد میں مقیم ہو گیا تھا۔ اگر وہ مل جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ انتظامیہ کو حکم دیا گیا تو وہ اوپر سے لے کر نیچے تک حرکت میں آئی۔ انہوں نے باورچی کو ڈھونڈ کر زیارت بھجوایا اور قائداعظمؒ کے لیے کھانا بنوایا جو قائداعظمؒ کو بہت پسند آیا۔ قائداعظمؒ نے پوچھا کہ کھانا کس نے بنایا ہے تو محترمہ فاطمہ جناح نے بتایا کہ ممبئی میں جو خانسامہ تھا اس نے بنایا ہے۔ قائداعظمؒ نے پوچھا وہ یہاں کیسے پہنچا تو انہیں سارا قصہ بتایا گیا۔

قائداعظمؒ اس بات پر بہت ناراض ہوئے کہ میری ذات کے لیے سرکاری ذرائع اور حکومتی مشینری کو ناجائز طور پر کیوں

استعمال کیا گیا۔ پھر حکم دیا کہ باورچی کے یہاں تک آنے میں جو خرچ ہوا ہے اس کو ان کی جیب سے ادا کیا جائے اور جنہوں نے ناجائز کیا، ان تک میری ناراضگی پہنچائی جائے۔

11 ستمبر کو کوئٹہ سے کراچی آنے کے بعد قائداعظمؒ گورنر ہاؤس میں سو گئے تو ڈاکٹر صاحبان آرام کے لیے اپنے ہوٹل میں چلے گئے۔ شب نو بجے کے قریب محترمہ فاطمہ جناح نے ڈاکٹروں کو فون پر اطلاع دی کہ کمزوری بڑھ گئی ہے اور بے قراری میں اضافہ ہو گیا ہے، آپ فوراً چلے آئیں۔ ڈاکٹر صاحبان فوراً گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ یہ قائداعظمؒ کے آخری لمحات تھے۔ آپ پر بے ہوشی طاری تھی۔ آنکھیں پتھرا رہی تھیں، کمزوری اور نقاہت بہت بڑھ گئی تھی۔ نبض کی رفتار غیر مسلسل ہو رہی تھی۔ کئی ٹیکے لگائے گئے مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ چند منٹ دل ڈوبنے لگا اور سانس رُک رُک کر آنے لگی۔ بے ہوشی کے عالم میں آپ کے منہ سے نکلا ”اللہ...... پاکستان۔“

قائداعظمؒ کی زندگی کا آخری دن محترمہ فاطمہ جناح یوں بیان کرتی ہیں: ”ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ 11 ستمبر کو ہمیں دو بجے دوپہر کراچی جانے کے لیے کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر موجود ہونا چاہیے۔ جیسے ہی قائداعظمؒ کا اسٹریچر طیارے کے کیبن میں لایا گیا، کپتان اور دوسرے عملے نے قطار بنا کر قائد کو سلامی دی۔ قائداعظمؒ نے بمشکل ہاتھ اُٹھا کر سلامی کا جواب دیا۔ جہاز میں قائد کو سب سے اگلے کیبن میں بستر مہیا کیا گیا۔ میں بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ہمارے کیبن میں ڈاکٹر مستری اور سسٹر ڈلس بھی موجود تھے۔ تقریباً 2 گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم ماری پور کے ہوائی اڈے پر سوا چار بجے اُترے۔ جوں ہی باہر آئے قائداعظمؒ کے ملٹری سیکرٹری، کرنل نالز نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ قائداعظمؒ کو اسٹریچر پر لٹا کر ایک فوجی ایمبولینس میں پہنچایا گیا جو قائد کو سرکاری رہائش گاہ کی جانب لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں اور سسٹر ڈلس بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ صرف کرنل الٰہی بخش، ڈاکٹر مستری اور ملٹری سیکرٹری گورنر جنرل کی گاڑی میں بیٹھ کر ایمبولینس کے پیچھے چلنے لگے۔ تقریباً چار پانچ میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایمبولینس عجیب آواز کے ساتھ اچانک رُک گئی۔ پانچ منٹ کے بعد میں باہر نکلی۔ صرف مجھے بتایا گیا کہ ایمبولینس کا پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ ڈرائیور گھبراہٹ اور بے چینی کے ساتھ انجن کو دیکھنے لگا۔

جیسے ہی میں دوبارہ ایمبولینس میں داخل ہوئی، قائد کی بھنویں اور ہاتھ معمولی جنبش کے بعد آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ میں آہستہ سے ان پر جھک گئی اور بتایا کہ انجن خراب ہو گیا ہے۔ انہوں نے آرام سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ہم دوسری ایمبولینس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ گورنر جنرل والی کیڈلک اتنی بڑی نہ تھی کہ اس میں اسٹریچر رکھا جا سکتا۔ ہم انتظار کا زہر پینے پر مجبور تھے۔ نزدیک ہی مہاجرین کی سیکڑوں جھگیاں تھیں جو پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے گھروں سے گئے ہوئے تھے۔ انہیں کیا معلوم ان کا قائد جس نے انہیں رہنے کے لیے سرزمین مہیا کی تھی، آج ان کے درمیان بے یارو مددگار پڑا ہے۔ قائداعظمؒ کی زندگی تیزی سے گھٹ رہی تھی۔ ہم نے ایک گھنٹہ انتظار کیا۔ میری زندگی میں کوئی گھنٹہ اتنا لمبا اور تکلیف دہ نہیں گزرا تھا۔

آخر کار ایک دوسری ایمبولینس آئی۔ قائداعظمؒ کا اسٹریچر اس میں رکھا اور ہم گورنر جنرل ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمیں ماری پوری سے گورنر جنرل ہاؤس جانے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے بتایا کہ قائد نے بڑی جرأت کے ساتھ سفر کی صعوبت برداشت کی ہے۔ انہیں بہت جلد نیند آ گئی۔ ڈاکٹر تھوڑی دیر میں آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ میں اب اپنے بھائی کے ساتھ کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ وہ پُرسکون گہری نیند سو رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دو گھنٹے سوئے ہوں گے، پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھا اور آہستہ سے سر ہلا کر مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران رہ گئی جب انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا: ”فاطی! خدا حافظ! لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔“ اس کے بعد ان کا سر آہستہ سے دائیں طرف جھک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

قائداعظمؒ کی وفات کی خبر پورے ملک میں پھیل گئی۔ تمام ملک سوگ وار تھا جیسے پاکستانیوں کے سر سے ان کے شفیق باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہو۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ کے مطابق وہ بہت رقت انگیز منظر تھا۔ کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر مستری کھڑے تھے اور دوسری جانب فاطمہ جناح اشک بار تھیں۔ وہ اس درد انگیز منظر کی تاب نہ لا سکیں اور ایک طرف صوفے پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ میں نے نرس سے کہا کہ وہ فاطمہ جناح کو تسلی دیں۔

میں خود قائد کے سرہانے بیٹھ گیا۔ میں نے دیر تک ان کی آنکھیں بند رکھیں۔ پاکستان یتیم ہو گیا تھا۔ میدانِ سیاست کا شہ سوار اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

ریڈیو پاکستان کے نمائندے نے قائداعظمؒ کے جنازے کی درج ذیل تفصیلات تحریر کیں:

11 ستمبر 1948ء کی رات کراچی ریڈیو اسٹیشن کا عملہ اپنی اپنی قیام گاہوں کو روانہ ہوگیا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ آج کے پروگرام بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئے۔ بخاری صاحب بھی حسبِ معمول گیارہ بجے ریڈیو اسٹیشن سے روانہ ہوئے۔ یکایک نیازی صاحب، اسٹیشن ڈائریکٹر کے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چونک کے اُٹھے۔ دروازہ کھولا تو بخاری صاحب نظر آئے۔ ''الٰہی خیر! چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ پاؤں میں لغزش ہے۔'' نیازی صاحب نے پوچھا۔ ''خیریت!'' بھینچی ہوئی آواز میں جواب ملا: ''قائداعظمؒ چل بسے۔'' نیازی صاحب صدمے کے باعث دیر تک خاموشی سے منہ تکتے رہے۔ لوگوں نے صبح سات بجے ریڈیو کھولا تو نہایت اندوہناک آواز یہ کہتی ہوئی پہنچی: ''قائداعظمؒ وصال پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔'' قائداعظمؒ کے سفرِ آخرت کا حال سناتے ہوئے ریڈیو کے اسٹاف کے دل فکر اور اضطراب سے کانپ رہے تھے۔

نمازِ جنازہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ نمازِ جنازہ کے خطبے میں انہوں نے فرمایا کہ قائداعظمؒ اورنگ زیب عالم گیر کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے راہ نما تھے۔ ان کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ افراد کی مایوسیوں کو کامرانی میں بدل دیا۔ چار لاکھ سے زائد لوگوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔

تدفین چھ بجے کے قریب شروع ہوئی۔ تمام ملکی اور غیر ملکی سفیر جمع تھے۔ لوگوں کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ آخری دیدار کے لیے چہرے سے کفن ہٹایا گیا۔ ایک نحیف سا چہرہ مگر وہی قوت ارادی، وہی عزم صمیم جو ان کی زندگی میں چہرے پر نظر آتا تھا، بدستور موجود تھا۔ کفن ہٹتے ہی لوگ شمع پر پروانے کی طرح گرنے لگے۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں اس ماتم میں پیش پیش تھے۔ پاک فضائیہ کے جہازوں نے مرقد پر پھول برسائے۔

لیاقت علی خاں نے قائداعظمؒ کے مزار کے لیے قوم سے فنڈ اکٹھا کرنے کی اپیل کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کثیر رقم جمع ہوگئی۔ 1948ء سے 1960ء تک بابائے قوم کا مزار شامیانے تلے رہا۔ صدر ایوب نے 8 فروری 1960ء کو مزار کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مقبرے کا اندر سے قطر 70 فٹ اور باہر سے 72 فٹ ہے۔ مقبرہ 15 جنوری 1971ء کو مکمل ہوا۔

مزارِ قائد کے پہلو میں بانیٔ پاکستان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر اور صدر نورالامین کے مزارات ہیں اور چاروں مزار ایک ہی ہال میں ہیں۔

پیارے بچو! قائداعظمؒ سے محبت کرنے والے بے شمار ہیں اور کبھی کم نہ ہوں گے۔ ان کی رحلت ایک عظیم انسان کے طور پر یاد رہے گی اور دل خون کے آنسو روتا رہے گا۔ آپ کے اصولوں کو اپنی تقریروں میں رٹے رٹائے جملوں میں کہنا تو بہت آسان ہے لیکن ان پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ پاکستان کی بقاء اسی میں ہے کہ اس عظیم شخصیت کے اصولوں پر عمل کیا جائے تو عہد کیجیے کہ آپ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور پیارے وطن پاکستان سے محبت کرنے کا حق ادا کریں گے۔ ان شاء اللہ! ☆☆☆

بچوں کی نگرانی

بچوں کی نگرانی ایک حوصلہ آزما کام ہے والدین کے لیے مشکل اور تکلیف دہ۔ اس معاملہ میں اعتدال پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اگر زیادہ نگرانی کریں گے تو بچہ ایک قسم کی گھٹن اور پابندی محسوس کرے گا اگر بہت کم نگرانی ہوگی تو وہ بُری عادات بھی سیکھ سکتا ہے۔ لہٰذا معتدل رویہ اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔

اب یہ فیصلہ بھی مشکل ہے کہ نگرانی کے زیادہ یا کم ہونے کا کس طرح معلوم کیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ بات معلوم کی جائے کہ بچہ جس چیز سے کھیل رہا ہے وہ اسے کس قدر پسند ہے۔ اگر اس کے پاس نیا کھلونا ہوگا تو وہ زیادہ دیر کھیلنا پسند کرے گا۔ جہاں وہ کھیلنا چاہ رہا ہے تو اس جگہ سے بقیہ چیزیں ہٹا دیجیے۔ گندا ہوگیا ہے تو ہاتھ منہ دھونے میں اس کی مدد کیجیے۔ صابن لگایئے پانی ڈالیے یہ سب کام نگرانی ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔

نگرانی کے لیے ایسے فرد کو آگے آنا چاہیے جو بچوں کے لیے ہمدرد اور مشفق ہو۔ اگر وہ بھائی، بہن، ماں یا استاد ہے جن سے بچہ بہت مانوس ہے تو نہ بچے کو مشکل پیش آئے گی نہ نگران کو دقت ہوگی۔ اگر بچے کوئی ایسا کھیل کھیل رہے ہیں جن میں گندے ہونے کا زیادہ خدشہ ہے تو نگرانی دوسرے کھیلوں کی نسبت یہاں زیادہ کرنی پڑے گی لیکن ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ بچہ کھیل رہا ہے اور ہم بار بار ٹوک کر اسے کہہ رہے ہیں ''اب ایسا نہ کرو، ویسا نہ کرو، گندے ہو جاؤ گے۔'' مناسب موقع دیکھ کر اور خاموشی سے بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔

بچوں کو ایسی جگہ کھیلنے کے لیے نہ بھیجا جائے جہاں کوئی تالاب یا جھیل وغیرہ ہو۔ اگر ہم نگرانی کر رہے ہیں تو بھی یہ ندی کنارے کھیل باعث نقصان ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری توجہ ان پر نہ رہے اور وہ کھیل کے دوران پانی میں گر جائیں۔

گھروں میں ایسی خطرناک اشیاء کو بچوں کی پہنچ سے باہر رکھیں۔ اگر کوئی ایسی الماری ہے جو خود بخود کھل اور بند ہو سکتی ہے تو اسے فوراً ہٹا دیجیے یا تالا لگا دیجیے۔

بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جائیں تو بھی یہ ان کی بہترین نگرانی ہوگی۔ بچے اپنے ذہن میں کھیل کے لیے جو چھوٹے چھوٹے منصوبے بناتے ہیں، ہمیں ان پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

بچوں کی کھیل کی اشیاء اور جگہوں کی مناسبت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ اونچی جگہوں پر، چھت پر، ڈھلوان جگہ پر بچوں کو کھیلنے نہ دیں۔ بچوں کے کھلونے ایسے ہوں جن سے انہیں آپ کی غیر موجودگی میں گزند پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ کھلونے مضبوط ہوں۔ چھ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے ایسے کھلونے مناسب رہیں گے۔ گیند، گاڑی، خالی ڈبے، گڑیا، موٹر کار، رنگین پنسلیں، رنگین چاک، گڑیا کے برتن اور گھر، کاغذ رنگدار اور چپکیلے، جانوروں کے کھلونے، کشتیاں۔

سمندر کے راہی

زاہدہ حمید

ایک سرد رات میں دو خوب صورت بچے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اُونچے اور آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں میں رہنے والے مکین اور بنگلوں کی چار دیواری میں محوِ خواب زندگی گزارنے والوں کو کیا خبر یہ معصوم بچے بھی کسی کے لختِ جگر ہیں۔

''میری نظریں مستقل انہیں دیکھ رہی تھیں کیوں کہ میں ایک درخت کی آڑ میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔''

آخر یہ بچے ظالم سردی سے کب تک نبرد آزما ہوتے رہیں گے۔ ''بس'' ابھی میری نظریں ان کا چہرہ پڑھ رہی تھیں کہ وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یک دم میں نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا اور ان کی تلاش میں چل پڑا۔ ایسی یخ بستہ ہوا میں نہ کوئی آدم زاد لیکن پتوں کی سرسراہٹ میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی چیز میری قمیص سے لپٹی ہے۔

میں نے دیکھا تو وہ معصوم بچے جن کے چہرے بے رحم سردی نے سفید برف کی مانند کر دیئے تھے، مجھ سے التجا کر رہے تھے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ سو میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ یہاں پہنچتے ہی دونوں نے اپنی معصوم نظروں سے گھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور حیرت کے کئی چراغ ان کی آنکھوں میں جلنے لگے۔ بس اسی طرح نیند کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ خورشید کی خوب صورت کرنوں سے جب ان کی آنکھ کھلی تو میری طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو اور کیا نام ہے؟''

ان میں سبز آنکھوں والے نے اپنا نام زریاب بتایا اور کہا: ''انکل! ہم اس شہر میں نئے آئے ہیں۔ وہ کیسی بُری گھڑی (وقت) تھی جب ہم اسکول کی چھٹی کے بعد نکلے تو ہمارے کانوں نے عجیب آواز سنی اور ہمیں ہر طرف سے لاتعلق کر دیا تھا۔ اتنے میں، کچھ آوازیں ہم سے کہہ رہی تھیں۔ 'چلو! انہیں دوسرے شہر میں لے جا کر فروخت کر دیں۔' لیکن ہم نے کسی نہ کسی طرح ان سے پیچھا چھڑایا اور قسمت نے ہمیں یہاں پہنچا دیا۔'' جب زریاب نے بات مکمل کر لی تو کہا۔ ''یہ میرا چھوٹا بھائی افراسیاب ہے۔'' میرے پوچھنے پر زریاب نے بتایا کہ میں چھٹی اور یہ چوتھی جماعت کے طالب علم ہیں۔ ''انکل! ہمیں اپنے امی ابو کے پاس پہنچا دیں۔'' یہ کہتے کہتے وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کا سر میرے ہاتھ میں تھا جو بخار سے جل رہا تھا لیکن افراسیاب اپنی معصوم سوچوں میں گم تھا۔

میں نے فوراً گاڑی نکالی، زریاب کو اس میں لٹایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تسلی

دی۔ موسمی بخار نے اپنا کام خاصا دکھا دیا ہے، لہٰذا ڈاکٹر کی ہدایت کا پرچہ اور دوائی لے کر زریاب کو گود میں لے کر جب گھر میں داخل ہوا تو بھائی کی حالتِ زار دیکھ کر پہلی بار افراسیاب نے اپنے لبوں کو کھولا۔

''انکل! میرے بھائی کو کیا ہوا ہے؟'' میں نے بستر پر لٹا کر لحاف اوڑھا دیا اور افراسیاب کو گود میں بٹھا کر خوب پیار کیا اور اس سے پوچھا۔ ''بیٹا! تم اپنے والدین کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' افراسیاب نے کہا۔ ''میرے ابو کا نام شیر زمان اور امی کا نام رابعہ ہے۔ آہ! میری امی بھی اسی طرح چائے بناتی تھیں۔'' بالآخر ایک دن زریاب بالکل ٹھیک ہو گیا اور کیوں نہ ہوتا؟ زبیر صاحب نے اس کی اتنی دیکھ بھال جو کی تھی۔ زریاب کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ نیوی میں ایک اعلیٰ عہدے پر ملک کی خدمت کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ میرے دو بچے احمد اور وقار ہیں مگر نانا اور نانی کی طبیعت کی خرابی کے باعث ابھی لاہور میں ہی مقیم ہیں۔'' زبیر صاحب کی بیوی فریدہ رحمدل اور سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ افراسیاب نے حیرت سے پوچھا۔ ''انکل! نیوی میں تو بہت بہادر بچے جاتے ہیں ناں۔ کیا آپ بھی بچپن میں بہادر تھے؟''

زبیر صاحب نے بڑے جوش سے کہا۔ ''جی ہاں! میں بھی انہی لوگوں کی طرح بہادر اور اپنے ملک پر نثار ہونے والا سپاہی ہوں۔'' دونوں بھائیوں نے بھی پُر زور نعرہ لگایا۔ ''ہم بھی اپنے سمندروں کی حفاظت کریں گے۔'' دوسرے دن زبیر صاحب دونوں بچوں کے ہمراہ ائیرپورٹ پہنچے تو احمد اور وقار اپنے ابو کے سینے سے لپٹ گئے۔ فریدہ کو تو سب کچھ وہ پہلے سے بتا چکے تھے، لہٰذا سب گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل پڑے۔ مختلف ذرائع سے ان معصوم پھولوں کے والدین کی بم دھماکے میں جان کھو دینے کی اطلاع بجلی بن کر گری تو دونوں بھائی گلے مل کر یوں روئے کہ جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ اس موقع پر فریدہ نے ماحول کو مزید افسردگی کی طرف جانے سے بچایا۔ احمد اور وقار بھی ساکت ہی کھڑے رہ گئے تھے، خاموشی کو توڑا اور بولے کہ تم بھی ہمارے بھائی ہو۔

وقت کی رفتار اپنا سفر تیزی سے طے کرتی رہی اور ان چاروں بچوں نے کڑیل جوان بن کر پاک بحریہ میں شمولیت اختیار کی۔ افراسیاب نے اسپیشل سروسز گروپ (SSG) کا شعبہ اپنے لیے منتخب کیا تو کہنہ مشق افسران اس کی تربیت کرنے لگے اور یوں وہ قابل افسر بن کر ملکی دفاع کرنے لگا۔ وقار اور زریاب نے ''سب میرین'' میں بھرتی ہو کر مادرِ وطن کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ احمد نے ''کمانڈوز'' میں جانا پسند کیا جہاں اس نے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے کہ دشمن کی ہوشیاری جھاگ کی مانند بیٹھ گئی۔

اللہ کی طرف سے ان چاروں جیالوں کا بڑا امتحان تھا جس کے لیے وہ یقیناً بحریہ کی زینت بنے۔ خوب صورت نیلے ساحلوں کی حفاظت کی دھن میں مگن جب یہ رات کی سیاہی میں سمندر کا سینہ چیرتا ہوا بحری جہاز آگے بڑھ رہا تھا تو دشمن سے دو دو ہاتھ ہوئے جس کی وجہ سے دشمن نے اپنی شکست کو دیکھتے ہوئے ایسا حملہ کیا کہ بحری بیڑے کا عملہ اگر اسی وقت جوابی کارروائی نہ کرتا تو مادرِ وطن کے سامنے ان کا سر خم ہو جاتا لیکن عظیم ماں کے چاروں سپوتوں نے اس مقدس فریضہ کو انجام دیتے ہوئے اپنی خوب صورت سفید وردی پر وطن کا پاک لہو لگا کر جامِ شہادت نوش کیا اور دشمن کو اپنی ہیبت سے تباہ و برباد کر دیا۔ بھلا کون سی ماں ہو گی جو ان پر فخر نہ کرے۔

وطنِ عزیز پر نثار ہو جانے والے خوبرو بیٹوں کی پُرسکون بند آنکھیں اپنے والدین سے کہہ رہی ہیں کہ ماں تجھے سلام، تیری عظمت کو سلام۔ جو تربیت تو نے ہماری کی ہے آج اس کا ہم نے حق ادا کر دیا اور وطنِ عزیز کو ناپاک لوگوں کے عزائم سے پاک کر دیا۔ زریاب اور افراسیاب کے دمکتے چہرے پر لکھا تھا۔

''امی ابو! ہمیں اس وقت کے لیے بچائے رکھنے پر بہت شکریہ۔''

☆☆☆
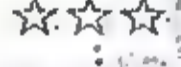
دُعا کا طریقہ

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے اس طرح ہاتھ اٹھا کر مانگا کرو کہ ہتھیلیوں کا رخ سامنے ہو، ہاتھ الٹے کر کے نہ مانگا کرو اور جب دعا کر چکو تو اٹھے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیر لو۔

فضالہ بن عبید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ اس نے نماز میں دعا کی، جس میں نہ اللہ کی حمد کی نہ نبی ﷺ پر درود بھیجا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس آدمی نے دعا میں جلد بازی کی پھر آپ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بلایا اور اس سے یا اس کی موجودگی میں دوسرے آدمی کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو دعا کرنے سے پہلے اس کو چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے، پھر اس کے رسول پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے مانگے۔ (جامع ترمذی)

این میری شمل

این میری شمل (پیدائش 7 اپریل 1922ء) ایرانیات، اقبالیات، سندھیات اور علومِ مشرق کی ماہر، اسلامی تہذیب کی معروف محقق اور معروف مستشرق جرمنی کے شہر ایرفورٹ میں پیدا ہوئیں۔ انیس برس کی عمر میں بون یونی ورسٹی سے مملوک مصر میں خلیفہ اور قاضی کا رتبہ کے عنوان پر پی ایچ ڈی کیا۔ ان مستشرقین کے برعکس جو اسلام میں خامیاں اور اس کا مغرب سے تصادم تلاش کرتے رہتے ہیں، ایسی محقق تھیں جنہوں نے اسلام کا مطالعہ اور تحقیق ان کے تخلیقی جوہر اور دانش کو ڈھونڈنے کے لیے کیا۔

این میری شمل 1958ء سے متعدد بار پاکستان گئیں۔ وہ پاکستان کو اپنا دوسرا گھر قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے پاکستان میں اقبالیات، تصوف اور علوم مشرقی پر متعدد لیکچر دیئے۔ ان کو جرمن زبان کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی سمیت متعدد مشرقی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہیں پاکستان کی علاقائی زبانوں سندھی، سرائیکی، اور پنجابی سے بھی شغف تھا۔ این میری شمل کی انگریزی اور جرمنی شاعری کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جسے ان کی تخلیقی اور دانش ورانہ تنوع کا پتا چلتا ہے۔

این میری شمل سو سے زیادہ کتابوں کی مصنف تھی۔ ہاورڈ اور بون یونی ورسٹیوں میں تدریس کرتی رہیں۔ 1953ء سے وہ انقرہ یونیورسٹی میں بھی پانچ سال تک وابستہ رہیں۔ اس دوران انہوں نے ترکی زبان میں کتابیں لکھیں اور علامہ اقبال کے کلام ''جاوید نامہ'' کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کی بیشتر کتابیں اور مضامین تصوف کے موضوع پر ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسلمان مفکروں اور شاعروں کی سینکڑوں کتابوں کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کا گھر اسلام کے نایاب مخطوطوں سے بھرا ہوا تھا جس میں سے بہت سے نسخے انہوں نے بون یونی ورسٹی کو دے دیئے۔ انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام پر بھی ایک گراں قدر کتاب لکھی۔

انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری کے مجموعوں بانگ درا، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کا جو جرمن زبان میں ترجمہ کیا انہیں جرمن ادب میں ایک بڑا مقام حاصل ہے۔ جاوید نامہ کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ این میری شمل نے علامہ اقبال کے مذہبی خیالات کے مطالعہ پر مبنی ایک کتاب ''جبرائیل کے پر'' کے عنوان سے لکھی جسے اقبالیات میں ایک اہم کتاب شمار کیا جاتا ہے۔ پاکستان حکومت نے انہیں اقبالیات پر ان کے کام کے اعتراف میں 1988ء عالمی صدارتی اقبال ایوارڈ دیا۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں دنیا کے بہت سے اسلامی اور مغربی ملکوں نے انہیں لاتعداد انعامات سے نوازا۔ حکومت پاکستان نے 1983ء میں انہیں ہلال امتیاز اور بعد میں ستارۂ امتیاز دیا۔ لاہور میں نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک کو عظیم جرمن شاعر گوئٹے کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جب کہ نہر سے پار جو سڑک ہے وہ این میری شمل کے نام سے منسوب کی گئی ہے جس کے بارے میں وہ از راہ مذاق کہا کرتی تھیں:

''پاکستانیوں نے میرے مرنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔'' حکومت پاکستان نے ان کے نام سے ایک تعلیمی وظیفہ بھی جاری کیا۔ ☆☆

فرشتہ

یہ اردو اور فارسی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں اسے ملک کہا جاتا ہے اور اس کی جمع ملائکہ ہے جس کا مطلب ہے پیامبر۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے۔ فرشتے ایک قسم کی مخلوق ہیں۔ ان کے جسم نور کے ہوتے ہیں۔ یہ مخلوق خطا اور گناہ سے پاک ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''نہیں نافرمانی کرتے ہیں اللہ کی اس نے حکم دیا ان کو ادا کرتے ہیں وہ جیسا کہ حکم کیا جائے۔ (پ 28 ع 19)

یہ ہر وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں۔ یہ کھاتے پیتے بھی نہیں بلکہ ان کی غذا ذکرِ الٰہی ہے۔ حقیقت ان کی غیر مادی یا غیر جسمانی ہے۔ صورت اور بدن ان کے حق میں لباس کا حکم رکھتا ہے۔ جس کی شکل میں چاہیں متشکل ہو سکتے ہیں۔ ہاں قرآن شریف سے ان کے بازو ثابت ہیں۔ ان پر ایمان رکھنا چاہیے اور حقیقت اس کی اللہ پاک کے علم کے حوالہ کریں۔ (تکمیل الایمان)

فرشتے لاتعداد ہیں سوائے اللہ کے ان کی تعداد کو کوئی نہیں جانتا۔ ہر فرشتے کے لیے ایک مرتبہ خاص، مقام معلوم اور جگہ معین ہے۔ کوئی فرشتہ اپنے مقام سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ بعض فرشتوں کے ذمے مختلف کاموں کی انجام دہی ہے۔ مثلاً کچھ ایسے ہیں جن کے سپرد ہواؤں کا چلانا اور بارش برسانا ہے۔ بعض مخلوقِ خدا کو روزی پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ بعض عذاب قبر پر مامور ہیں۔ بعض فرشتے جہنم کے عذاب کے لیے مقرر ہیں۔ قرآن کریم میں دو فرشتوں کو کراماً کاتبین کہا گیا ہے۔ یہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کی نیکیوں اور بدیوں کا حساب لکھتے ہیں۔ احادیث میں جنت کے فرشتے کا نام ''رضوان'' اور دوزخ کے فرشتے کا نام ''مالک'' بتایا گیا ہے۔ ہاروت و ماروت دو فرشتے ایسے ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے علم سحر کو اس عالم میں ظاہر کروایا اور وہ بوجہ نافرمانی کے چاہ بابل میں معذب ہیں اور انہیں قیامت کے دن نجات ملے گی۔ چار خاص مقرب فرشتے ہیں۔ یہ حضرت جبرائیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت عزرائیلؑ اور حضرت اسرافیلؑ کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ پیغمبروں کے پاس وحی لے کر جاتے تھے۔ حضرت میکائیلؑ کے سپرد رزق کی تقسیم اور بارش برسانا ہے۔ حضرت عزرائیلؑ مخلوق کی روح قبض کرنے پر مامور ہیں۔ حضرت اسرافیلؑ قیامت کے دن صور پھونکیں گے۔ ان کی حقیقت اور ان کے کام اسرارِ الٰہی ہیں جن میں زیادہ غور کرنا لاحاصل ہے۔ قرآنِ پاک میں ان کی حقیقت، وجود اور ان کاموں کے متعلق جگہ جگہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ سورۃ الحاقہ میں آٹھ فرشتوں کا ذکر آیا ہے۔ یہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا فرش اُٹھائیں گے۔ یہ انسانی شکل میں بھی پیغمبروں کے پاس آتے رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حضرت جبرائیلؑ کے انسانی شکل میں سامنے آنے کی متعدد روایات کتب احادیث میں موجود ہیں۔ قبر میں سوال کرنے والے دو فرشتے منکر اور نکیر کہلاتے ہیں۔ ان کی شکلیں بڑی ہیبت ناک ہیں۔ موت کے وقت مسلمان رحمت کے فرشتے اور کافر عذاب کے فرشتے دیکھتا ہے۔ اسلام نے ان سب پر اجمالی ایمان رکھنا ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔ قرآنِ پاک کے تیسرے پارے میں کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ ترجمہ: ''سب ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ۔ فرشتوں کا انکار کرنے والے پر کفر لازم آتا ہے۔''
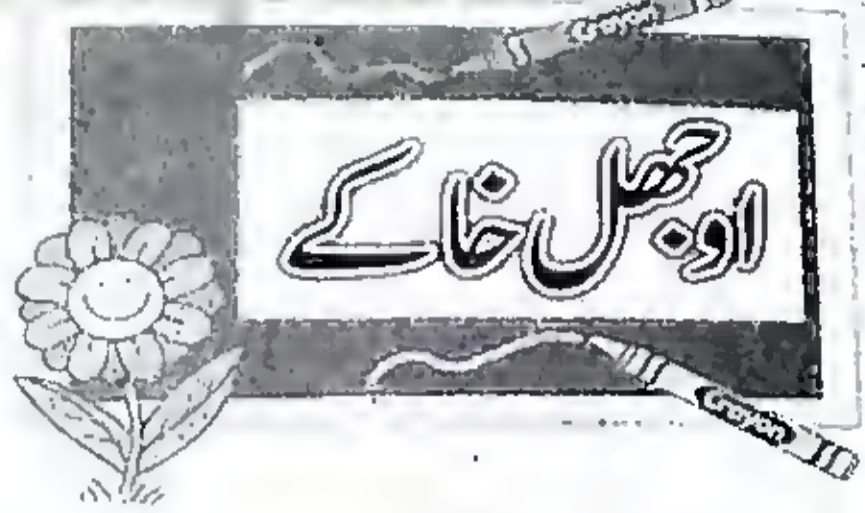
www.Paksociety.com
اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔
2015

"ایک دن میں آزاد کشمیر پر قبضے کا خواب دیکھنے والے دشمن کو اس کی اپنی سرزمین پر جا کر ختم کروں گا اور پھر میرا جسم قومی پرچم میں لپیٹ کر لایا جائے گا۔" یہ وہ الفاظ تھے جو کیپٹن کرنل شیر خان شہید نے سکردو جاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہے تھے۔

کرنل شیر خان کا نسلی تعلق پٹھانوں کے ایک معزز اور مشہور قبیلے "یوسف زئی" سے تھا۔ ان کے دادا جان غالب خان جہاد و سپہ گری کے ماہر تھے۔ 1948ء میں یہ غیور پٹھان ڈوگرہ سامراج کے خلاف تلوار اٹھائے اپنے قبیلے کے کچھ افراد کے ساتھ بے بس و بے کس مسلمانوں کی مدد کے لیے کشمیر پہنچا۔

یکم جنوری 1970ء...... وہ تاریخ تھی جب غالب خان کے سب سے بڑے بیٹے خورشید خان کے ہاں موضع نواں کلی، صوابی میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ دادا نے اپنے پوتے کا نام کرنل شیر خان رکھا تو خورشید خان نے کہا۔ "ابا جان! یہ کیا نام ہے؟ لوگ باتیں بنائیں گے۔ ٹھیک ہے نام منفرد ہے اور باوقار بھی...... مگر ہماری سابقہ روایات کے مطابق نہیں ہے۔" غالب خان نے بیٹے کو جواب میں کہا۔ "بیٹا! میں اس بچے کے چہرے پر اپنی پھیلی ہوئی خواہشات کو پورا ہوتے دیکھ رہا ہوں...... اس کا یہی نام رکھا جائے گا...... کرنل شیر خان۔"

کرنل شیر خان پانچ برس کے ہوئے تو انہوں نے گاؤں کی مسجد میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ چار باغ کے اسکول سے پرائمری پاس کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ مڈل اسکول سیری میں داخل ہوئے۔ 1985ء میں نواں کلی کے گورنمنٹ اسکول سے امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کے اساتذہ کے مطابق شیر خان انتہائی محنتی اور صاف گو طالب علم تھے۔ ایف اے کے امتحان کے بعد وطنِ عزیز کی محبت اور خدمت کا جذبہ انہیں پاک فضائیہ میں لے گیا۔ 1988ء میں وہ بہترین ائیر مین قرار دیے گئے۔ 1992ء میں بری فوج میں کمیشن کے لیے منتخب ہوئے۔ 14 اکتوبر 1994ء کو 27 رجمنٹ سندھ میں کمیشن ملا اور 17 اکتوبر 1996ء کو کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی۔

1998ء میں بھارتی فوج نے دو ریزرو (Reserve) بریگیڈ دراس اور کارگل بھیج دیے تھے۔ دشمن کے ارادے خطرناک تھے کیوں کہ وہ سیاچن کی طرح اس علاقے میں بھی ہماری دفاعی پوزیشنوں پر چڑھائی کر سکتا تھا۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر تمام دفاعی یونٹوں کو یہ حکم جاری ہوا کہ وہ اس سال موسم سرما میں اپنی اگلی پوزیشنوں سے انخلاء نہیں کریں گے۔ کیپٹن کرنل شیر کا شمار ایک نڈر اور پُرعزم پلاٹون کمانڈروں میں ہوتا تھا۔ سخت سردی اور برف باری کے باوجود انہوں نے نئی دفاعی پوزیشنوں میں پانچ نئی پوسٹیں قائم کیں، جوانوں میں گھل مل جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جوان ان کی پلاٹون میں جانے کا خواہش مند ہوتا تھا۔ پندرہ ہزار فٹ پر موجود ان پوزیشنوں نے اس سیکٹر کے دفاعی نظام کو انتہائی مضبوط

بتایا۔ عددی اور جنگی ساز و سامان میں برتری کے باوجود دشمن کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ 7 اور 8 جون 1999ء کی درمیانی شب دشمن کیپٹن کرنل شیر خان کی پوسٹ کے بہت قریب آ گیا۔ کیپٹن کرنل شیر خان نے دشمن کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ چناں چہ بھاری جانی و مالی نقصان پہنچا کر دشمن کی کارروائی کو بے اثر کر دیا۔ اس کے بعد 8 اور 9 جون کی درمیانی شب اپنے دس جوانوں کے ساتھ دشمن کے اجتماع پر کاری ضرب لگائی۔

30 جون کو بارہ ناردرن لائٹ انفینٹری پر دشمن کی 8 ماؤنٹین انفینٹری ڈویژن نے حملہ کر دیا۔ یہ ڈویژن 228 آرٹلری گنوں اور ہندوستانی ایئر فورس کی مدد کے ساتھ آئی تھی۔ میدانِ کارزار گرم ہو چکا تھا، ہمارے صف شکن مجاہد دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے تھے۔ کیپٹن کرنل شیر اس وقت داہنی طرف والی کمپنی کی کمان کر رہے تھے، جو آگے تھی۔ آپ نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات بٹالین کمانڈر کو پیش کیں۔

''سر! جنگ کا زیادہ زور آپ کی طرف ہے۔ اگر مجھے اجازت دیں تو میں ایک پلاٹون کے ساتھ آپ کی طرف آنا چاہتا ہوں۔''

''ہم کوشش میں ہیں کہ آپ کا سیکٹر کسی دوسری بٹالین کو دے دیں۔ بہرحال جیسے ہی اجازت ملی، آپ کو بتا دیا جائے گا'' بٹالین کمانڈر نے جواب دیا۔

کیپٹن شیر خان کی کوششیں رنگ لائیں اور 30 جون کی رات کو اجازت مل گئی۔ کیپٹن شیر خان دفاعی پوزیشنیں نئی بٹالین کو دے کر 3 اور 4 جولائی کی درمیانی شب بٹالین کمان یونٹ میں آ گئے۔

''سر! شیر آ گیا......'' کیپٹن امیر نے بٹالین کمانڈر کو بتایا۔ بٹالین کمانڈر کیپٹن شیر خان کے آنے سے بہت خوش ہوا۔ اسے اندر بلایا، گلے لگایا اور تازہ ترین صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔

''کیپٹن! تم اپنے نام کی طرح شیر ہو...... اب تیاری کرو...... کل ہمیں جوابی حملہ کرنا ہے۔''

''بالکل ٹھیک سر...... یہی تو وقت ہے جس کے لیے تیاری کی تھی...... سر عمار کدھر ہے؟''

''وہ اگلے مورچوں پر دشمن کو روکے ہوئے ہے۔''

''اور اقبال......؟''

''اقبال تمہیں فائر میں مہیا کرے گا...... دشمن پر بھرپور حملہ ہو گا اور اس کے بعد اپنا علاقہ دشمن سے واپس لے لیں گے۔''

''سر!...... میں گیا۔''

کیپٹن شیر خان 3 اور 4 جولائی کی درمیانی رات ایک بجے کے قریب اپنے مشن پر روانہ ہوا۔ 4 جولائی کو پورے علاقے کی قراولی (قراولی ترکی زبان کا لفظ ہے، مراد وہ فوجی دستہ جو آگے بڑھ کر دشمن کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے) ہوئی۔ منصوبے کو حتمی شکل دی گئی۔ 4 اور 5 جولائی کی درمیانی شب دشمن پر حملہ کیا گیا۔ حملے کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دشمن اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب کرنل شیر خان کو اپنی بائیں جانب آگے والی چوکی سے رابطے کا حکم ملا۔ اپنے نام کی طرح شیر دل مجاہد نے فورس تشکیل دی اور مشن کے لیے روانہ ہو گئے۔

دشمن کے کچھ دستوں نے پہلے سے استعمال ہونے والے راستے پر بلاکنگ پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ اس لیے دشمن کی طرف بڑھنے کے لیے نئے راستے کا انتخاب کیا گیا۔ کیپٹن شیر خان دشمن کے فائر کی پروا نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اچانک دشمن کی ایک کمپنی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ کیپٹن شیر خان نے مشن ترک کرنے کی بجائے دشمن سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دشمن پر حملے کی فوری تدبیروں کے بعد شیر خان دشمن کی صفوں کے اندر گھس گئے۔ شدید فائرنگ کے نتیجے میں کیپٹن شیر خان کا جسم چھلنی ہو گیا اور یوں اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے شیر کی سی بہادری دکھاتے ہوئے انہوں نے اپنی جان اپنے وطن کو پیش کر دی۔

کیپٹن کرنل شیر خان اپنی شہادت سے قبل مسلسل تین راتوں سے جاگ رہے تھے۔ شہادت کے وقت روزے سے تھے۔ دشمن نے بھی آپ کی بہادری کا اعتراف کیا۔ جب آپ کی لاش اُٹھالی گئی تو انگلی ٹرائیگر کے اوپر تھی۔ 18 جولائی کو آپ کا جسدِ خاکی قومی پرچم میں لپٹا ہوا آیا تو آپ کی کہی بات پوری ہو گئی تھی۔

''میں دشمن کو اس کی اپنی سرزمین پر جا کر ختم کروں گا اور پھر میرا جسم قومی پرچم میں لپیٹ کر لایا جائے گا۔''

ناقابلِ فراموش جرأت، بہادری اور ولولہ انگیز قیادت کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انہیں ملک کا اعلیٰ ترین اعزاز نشانِ حیدر دیا۔ بلاشبہ کیپٹن کرنل شیر خان جیسے شیر دل مجاہد اس وطنِ عزیز کے عظیم محسن ہیں جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لیے قربان کر دیا۔

ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر

اونٹ

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب و غریب شاہکار

شیخ عبدالحمید عابد

سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبداللہ بن عبدالعزیز بن باز مرحوم نابینا تھے۔ ایک روز ان سے کسی نے پوچھا: ''اگر اللہ تعالیٰ آپ کو آنکھیں عطا کر دے تو سب سے پہلے کیا چیز دیکھنا چاہیں گے۔'' انہوں نے بلاتوقف جواب دیا: ''میں سب سے پہلے اونٹ دیکھنا چاہوں گا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بھی آسمانوں، پہاڑوں اور زمین پر غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے اونٹ کا ذکر پہلے فرمایا ہے۔'' اور کہا: ''کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے۔''

اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، اونٹ کے منہ میں زیرہ، دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اردو زبان میں یہ جملے بطور محاورے استعمال ہوتے ہیں۔ ہر مخلوق کی طرح اونٹ بھی پروردگار کی قدرت کا حیرت انگیز شاہ کار ہے۔

اونٹ عجیب و غریب جانور ہے۔ ہمیں دودھ، گوشت، اون اور کھال بہم پہنچانے کے علاوہ اس کی اور بھی خصوصیات ہیں۔ اسے صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے۔ یہ گرم موسم میں صحرا میں جہاں پانی کی ایک بوند نہ ہو انسان کو مشکل ترین سفر میں بحفاظت لے جاتا ہے۔ صحراؤں میں پانی حاصل کرنے کے ذرائع نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ اونٹ تقریباً تیس دن سردیوں میں اور کم و بیش پانچ دن موسم گرما میں بے آب و گیاہ سفر کر سکتا ہے۔ وہ ایک قطرہ پانی پیئے بغیر اپنے مالک کو مسلسل چار سو کلو میٹر سفر کرا سکتا ہے۔ جب وہ کسی نخلستان پہنچتا ہے تو بڑی مقدار میں پانی ذخیرہ کر لیتا ہے، جیسے اس کی کوہان پانی کا ٹینک ہو۔ دس منٹ کے اندر اندر دو سو لیٹر تک پانی پی جاتا ہے۔ تازہ ترین تحقیق سے پتا چلا ہے کہ اونٹ کی کوہان پانی کے ذخیروں کی طرح کام کرتی ہے۔ ناگفتہ بہ حالات میں یہ اپنی کوہان کی چربی کو پُر اسرار کیمیائی عمل کے ذریعے پانی میں تبدیل کر دیتا ہے اور یوں اپنے جسم میں پانی کی کمی پوری کر لیتا ہے۔

اونٹ کی کوہان کا چھوٹا بڑا ہونا غذا پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ اچھی غذا سے بڑھ جاتی ہے اور جب ریگستان میں سفر کے دوران اسے خوراک نہیں ملتی تو کوہان کی چربی پگھل کر خوراک کا کام دیتی ہے۔ اس لیے فاقہ کشی میں کوہان بہت چھوٹی ہو جاتی ہے۔ عرب، افریقہ، پاکستان اور ہندوستان میں ایک کوہان والا اونٹ ہوتا ہے۔ اس کو ''عربی اونٹ'' کہتے ہیں۔ اس کی مشہور قسم ناقہ ہے۔ ناقہ سواری اور دوڑ کے لیے بہت موزوں ہے۔ دوسری قسم دو کوہان والے اونٹ کی ہوتی ہے۔ یہ مغربی ایشیاء میں ہوتے ہیں۔ دو کوہانوں والے اونٹ کے بال زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ یہ بڑا جفاکش اور طاقت ور ہوتا ہے۔ وسط ایشیاء کے ملکوں میں پائے جانے والے دو کوہانوں والے اونٹوں کی ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ یہ اونٹ

پہاڑی ملکوں میں جنوبی سائبیریا، چین اور سمرقند میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ اونٹ نمکین درختوں کی ٹہنیاں بہت شوق سے کھاتے ہیں اور کھاری پانی کو بڑے شوق سے پیتے ہیں۔

ہمیں سب اونٹ ایک ہی طرح کے معلوم ہوتے ہیں لیکن عرب کے رہنے والے ان کی بیس قسموں سے واقف ہیں۔ ان میں سے اوپر بیان کردہ قسمیں خاص ہیں جن کو ہم پہچان سکتے ہیں۔ اسی طرح اونٹ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن پر بوجھ لادا جاتا ہے اور دوسری وہ جو سواری کے کام آتے ہیں۔

اونٹ سات فٹ کا قدآور بہت ہی سادہ جانور ہے۔ اپنے ڈیل ڈول اور جسم کے اعتبار سے توجہ کا باعث بنتا بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بہت سی نشانیوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی بڑی بڑی آنکھیں عطا کی ہیں کہ دن ہو یا رات وہ ان سے دُور تک بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

اس کی لمبی لمبی پلکیں آنکھوں کو صحرائی ریت سے بچاتی ہیں لیکن اصل حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کے پپوٹوں کا آدھا حصہ شفاف جھلی کی صورت میں ہوتا ہے۔ صحراؤں میں جب آندھی تیز اور ریت زیادہ ہوتی ہے تو وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے لیکن شفاف جھلی سے بآسانی دیکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی معاملہ ناک اور کانوں کا بھی ہے۔ اتنے بڑے ڈیل ڈول کے باوجود کانوں کا حجم نسبتاً چھوٹا اور مقام سر کے تقریباً پچھلی جانب ہے۔ بالوں میں گھرے ہوئے چھوٹے کانوں کے پنکھ بآسانی پیچھے کو تہہ ہو جاتے ہیں۔

لمبی لمبی ٹانگیں جہاں مسافت جلد طے کرنے کا ذریعہ ہیں، وہیں اونٹ کے باقی سارے جسم کو صحراؤں میں دہکتی ریت کی گرمی سے دُور رکھتی ہیں۔ اس کے پاؤں کی ساخت بھی خالق کائنات کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اونٹ کا پاؤں دو حصوں میں بٹا ہوتا ہے لیکن مضبوط جلد کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا ہوا بھی۔ اعصاب میں گندھے ہوئے نرم گوشت کی ایک تہہ ہوتی ہے جو پاؤں زمین پر پڑتے ہی پھیل جاتی ہے۔ پھر اس کے نیچے موٹی کھال ہوتی ہے جو پورے پاؤں کو ایک مضبوط چوڑے جوتے کی شکل دے دیتی ہے۔ پاؤں کی یہ ساخت پاؤں کو جھلسی ریت کی گرمی سے بچاتی ہے اور ریت میں دھنسنے سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اونٹ چلتے ہوئے باری باری پہلے ایک طرف کی اگلی پچھلی دونوں ٹانگوں کو اکٹھے آگے بڑھاتا ہے اور پھر دوسری طرف کی، یوں جیسے کشتی کے چپو چلائے جاتے ہیں۔ تیزی سے باری باری چلتے ہوئے اونٹ کے چپو اسے دیکھنے میں بھی صحرائی جہاز ثابت کرتے ہیں۔

اس کے پیٹ کے نیچے سخت کھال کا تکیہ سا بنا ہوتا ہے۔ گرمی جتنی بھی ہو، اس تکیے کو پار نہیں کر سکتی۔ سخت کھال کا یہی تکیہ اس کے لیے ایک خطرناک ہتھیار کا کام بھی دیتا ہے۔ اگر کبھی کسی کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانا ہو تو اونٹ اسے اپنے جبڑے کے ساتھ دبوچتے ہوئے اپنے کھردرے پیٹ کے ساتھ روند دیتا ہے۔ پتھر کی مانند اس سخت تکیہ کو عربی میں کلکل کہتے ہیں۔

اونٹ کی سب سے حیرت انگیز خوبی اس کا شدید پیاس کو برداشت کر لینا ہے۔ یہ پانی کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو اپنے جسم میں محفوظ کر لیتا ہے۔ موسم سرما میں پانی دستیاب ہونے کے باوجود بھی یہ زیادہ پانی نہیں پیتا اور ایک ایک ہزار کلو میٹر کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ گرمی کچھ بڑھتی ہے تو ہفتے دو ہفتے بعد ایک بار پانی پی لینے پر اکتفا کرتا ہے لیکن جب گرمی بہت زیادہ ہو تو اسے ہر پانچ روز بعد تقریباً 25 لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اونٹ ہی نہیں خالق کائنات کی ہر مخلوق کے بارے میں سائنس دان آئے روز نت نئے انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی غیر مسلم سائنس دان ایسے ہیں کہ انہیں جب مخلوق سے متعلق مختلف قرآنی و نبوی ارشادات معلوم ہوتے ہیں تو ان کی ایک بڑی تعداد نے اپنے خالق کو پہچان لیا ہے۔ وہ رسول اکرم ﷺ کی حقانیت پر ایمان لے آئے ہیں اور مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ اونٹ کی قدرتی خوراک درختوں کی ٹہنیاں، سبز پتے، جھاڑیاں اور گھاس ہیں۔ دانہ کے ساتھ سبزہ ہونا ضروری ہے ورنہ اونٹ بیمار ہو جاتا ہے۔ جھاڑیاں خواہ کتنی ہی خاردار اور کسیلی ہوں اونٹ بے دریغ کھا جاتا ہے۔ اونٹ کے معدے کے تین خانے ہوتے ہیں۔ یہ بہت سا پانی پہلے خانے کی دیواروں کی تھیلیوں میں بھر لیتا ہے۔ تھیلیاں پانی سے بھر جاتی ہیں تو ان کے تنگ منہ کے ارد گرد پٹھوں کو سکیڑ لیتا ہے۔ تھیلیاں بوقت ضرورت کھل بھی جاتی ہیں اور بند بھی ہو جاتی ہیں۔ کھلنے پر اونٹ ان تھیلیوں سے پانی باہر نکال لیتا ہے۔ اونٹ کے نتھنے بہت حساس ہوتے ہیں جن سے یہ سونگھنے کا کام بھی لیتے ہیں اور ماحول کے مناظر کو محسوس کرنے کا بھی اور

سخت سے سخت حالات سے نبرد آزما ہونے کا بھی۔

اونٹ ریگستانی علاقوں میں بار برداری اور سواری کے کام آتا ہے جب کہ سرسبز و شاداب ملکوں میں کھیتی باڑی کے کام بھی آتا ہے۔ کنوؤں سے پانی نکالنے کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔ اس کے بالوں سے کپڑا اور خیمے بنائے جاتے ہیں اور رسیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ اس کی ہڈی صاف کر کے ہاتھی دانت کی جگہ استعمال کی جاتی ہے۔ اس کو آسانی سے سدھایا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ترتیب سے درج ذیل آیات میں اونٹ کا ذکر کیا گیا ہے: سورۃ الانعام، الاعراف، ھود، یوسف، بنی اسرائیل، الحج، الشعراء، القمر، الحشر، المرسلت، التکویر، الغاشیہ، الشمس۔

قرآن کریم میں متعدد قصے کہانیاں طرح طرح کے عجیب و غریب جانوروں کے گرد گھومتے ہیں۔ ایک قصہ معصوم اونٹنی کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام بہت نفیس انسان تھے۔ آپؑ کا زمانہ 2400 قبل از مسیح کا ہے۔ آپؑ قوم ثمود پر پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ یہ قوم بہت اکھڑ اور جھگڑالو تھی۔ غریب لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔ بت پرست تھے۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ کو ماننے سے انکار کیا۔ ایک دن ثمودیوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے عجیب و غریب فرمائش کی کہ وہ اس وقت انہیں مانیں گے جب تک وہ کوئی معجزہ نہ دکھا دیں۔ انہوں نے فرمائش کی کہ ان کے سامنے والی چٹانوں سے ایک اونٹنی دفعتاً نمودار ہو جائے اور آتے ہی ایک بچے کو جنم دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا مانگی تو ایک خوب صورت جسم والی اونٹنی فوراً نمودار ہو گئی اور سب کے سامنے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس کے باوجود قوم ثمود اپنی بُری حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی بہت خوش طبع تھی۔ وہ بلا جھجک اِدھر اُدھر پھرتی تھی، بے حساب دودھ دیتی تھی۔ اور سب بلا اجازت دودھ استعمال کرتے تھے۔ قوم ثمود نے اونٹنی کو مار ڈالا اور اس کی ہلاکت پر بہت خوش ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے بدقماش قوم پر عذاب نازل کیا۔ وہ لوگ زلزلے کی لپیٹ میں آ گئے۔ آسمان سے انتہائی کرخت آوازیں، اور ہول ناک گرج سنائی دی اور ساری قوم پلک جھپکتے ہی ہلاک ہو گئی۔ اس قرآنی کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھیجتا ہے، ان کی اطاعت فرض اور مفید ہے اور نافرمانی نقصان دہ ہے۔

انسان، خدا کی نشانیاں دن رات اپنی زندگی میں دیکھتا ہے جن سے خدا اپنے بندوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، لہٰذا ہم بندوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار رہیں۔ ☆☆☆

ایمان داری کام یابی ہے: اس دُنیا میں بے شمار لوگ آئے، اپنی زندگی گزاری اور پھر مٹی میں مل گئے مگر جنہوں نے انسانیت کی خدمت کی، اپنی زندگی کو ایک مقصد کے تحت گزارا، وہ تاریخ کے اوراق میں آج بھی زندہ ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ حالات کا گلہ شکوہ کرتے ہی نظر آتے ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود سے بھی بے زار ہی رہتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، وہ اگر کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ نیک نیتی اور جدوجہد سے معاشرہ میں ایک اچھا مقام حاصل کر سکتا ہے مگر اس کے لیے سب سے پہلی شرط ایمان داری ہے اور یہی راستہ کام یابی کا ہے جو ہمیں اپنی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بااختیار پیدا کیا ہے۔ بے شمار نعمتیں ہمارے لیے ہیں اور اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ہم معاشرہ میں اپنا مقام نہ بنا سکیں تو پھر ہمیں تنہائی میں بیٹھ کر اپنا احتساب کر کے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم میں کیا کمی ہے، کیوں زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے کو بھاگ رہے ہیں اور جو ہم سے آگے نکل گئے، ان میں کیا خوبیاں ہیں۔ ایک بات جو ہم سب کو ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حالات بھی انسان کا ساتھ اس وقت دیتے ہیں جب خود ہمارے اندر آگے بڑھنے کی سچی لگن ہو گی اور ایمان داری ہمارے اندر ہو۔ ہم کسی کی ٹانگ کھینچ کر اوپر چڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مخلص رہیں۔ صرف دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ اپنے اندر کی پاکیزگی کو قائم رکھنے کے لیے ہم اپنے اندر برداشت کو جنم دیں۔ انتقام انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین کر اسے ناکارہ کر دیتا ہے اور جو انسان اپنے اندر دوسروں کو پروان چڑھانے کا جذبہ رکھتا ہو اور زندگی کی دوڑ میں کام یابی کی جستجو رکھتا ہو تو پھر حالات خود بخود اس کے حق میں ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے راستے کا تعین قدرت خود کرتی ہے اور جس معاشرہ میں ایسے افراد موجود ہوں پھر وہ شہر مثالی بن جاتا ہے اور وہ ملک قابل مثال بن جاتا ہے اور ایسے لوگ دُنیا میں جہاں بھی چلے جائیں وہاں وہ سر کے تاج سمجھے جاتے ہیں اور وہی لوگ کتابوں میں ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں مگر اس کے لیے پہلی شرط ایمان داری ہے۔ ہم نے اسی چیز سے پیچھا چھڑوا لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم حالات کا رونا رو کر اپنی بربادی خود پیدا کر رہے ہیں۔ آج تک چور بازاری اور لوٹ مار سے کوئی انسان خوش نہیں رہا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ فراڈ کر رہا ہے تو وہ اپنے ساتھ ہی فراڈ کر رہا ہے اس لیے انسان کو اپنے آپ سے مخلص رہتے ہوئے دوسروں کے ساتھ بھی وہی رویہ رکھنا چاہیے، تب کام یابیاں اس کی راہ میں ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی ہیں۔ انسان کی زندگی بہت مختصر ہے، پھر کسی کو اپنی موت کا بھی علم نہیں کہ کب اور کہاں اس کا مقدر بن جائے گی۔ اسی لیے جب موت آتی ہے تو بہت سے کام ادھورے ہی رہ جاتے ہیں جو پھر کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے اس لیے ہم اپنے ہر دن کو غنیمت اور آخری جانیں، اپنی سابقہ زندگی پر ایک نظر دوڑائیں، اپنی خامیاں نوٹ کریں اور پھر انہیں اپنے اندر سمیٹ لیں۔ اپنے راستے کا تعین کریں اور پھر ایک بار پوری ایمان داری کے ساتھ اس پر چل پڑیں مگر ہمت اور حوصلے سے۔ اس کے بعد پھر کام یابیاں آپ کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہو جائیں گی۔ اس کے بعد آپ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے۔ مرنے کے بعد بھی آپ تاریخ کے جھروکوں سے باہر جھانکتے رہیں گے اور لوگ آپ کی کام یابی کے قصے سنایا کریں گے مگر شرط صرف ایمان داری ہے کیوں کہ یہی کام یابی کا راز ہے۔

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ عبرانی زبان میں حضرت یونسؑ کو کیا کہتے ہیں؟

i۔ ایلیا ii۔ ڈیوڈ iii۔ ایبرا

2۔ نبیؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں اپنے کس عزیز کا خون معاف فرمایا تھا؟

i۔ حضرت حمزہؓ ii۔ حضرت عثمان غنیؓ iii۔ عامر بن ربیعہ

3۔ ''ثریا''، ''پروین'' کتنے ستاروں کے جھرمٹ کو کہتے ہیں؟

i۔ سات ستارے ii۔ چھ ستارے iii۔ آٹھ ستارے

4۔ یہ بات کس نے کہی کہ پانی میں چیزوں کا وزن کم ہو جاتا ہے؟

i۔ اقلیدس ii۔ ارشمیدس iii۔ فیثا غورث

5۔ مراکش کے شہر ''کیسا بلانکا'' کا نام ہسپانوی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

i۔ سرخ گھر ii۔ سفید گھر iii۔ سبز گھر

6۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کب قائم کی گئی تھی؟

i۔ 1920ء ii۔ 1922ء iii۔ 1924ء

7۔ علامہ اقبال کی اس غزل کے اشعار بانگ درا سے لیے گئے ہیں، شعر مکمل کیجیے

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی

8۔ سب سے پہلے کس ملک نے پاکستان کو تسلیم کیا؟

i۔ افغانستان ii۔ ایران iii۔ سعودی عرب

9۔ بانی کراچی کس شخصیت کو کہا جاتا ہے؟

i۔ پونجا جناح ii۔ جمشید مہتا iii۔ آئی آئی چندریگر

10۔ گولف میں استعمال ہونے والی چھڑی کو کیا کہتے ہیں؟

i۔ بیٹ ii۔ اسٹک iii۔ کلب

11۔ چاندی کا ایٹمی نمبر کیا ہے؟

i۔ 45 ii۔ 46 iii۔ 47

جوابات علمی آزمائش اگست 2015ء

1- ابرہہ 2- 17 اگست 1947ء 3- جلال بابا 4- عثمانیہ کالج 5- ولبھ بھائی پٹیل 6- حفیظ جالندھری 7- مولوی عبدالحق 8- میاں فیروز الدین 9- ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا 10- چوہدری رحمت علی

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ مطیع الرحمٰن، لاہور (150 روپے کی کتب)

☆ ایمن امین مغل، گوجرانوالہ (100 روپے کی کتب)

☆ ماہ رُخ، حیدرآباد (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ دعا یسین، سرگودھا۔ نجم السحر، ملک وال۔ رداء فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ منی الرحمٰن، لاہور۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ خدیجہ شجاعت، لاہور۔ محمد عرفان اقبال، لودھراں۔ علینا اختر، کراچی۔ آمنہ شیریں، ڈیرہ غازی خان۔ حافظ غلام غوث اصغر، لاہور۔ شمائلہ خان، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ اسماء جاوید انصاری، بہاول نگر۔ نسرین جمیل، عمرہ وحید، پشاور۔ طلحہ قیوم، لاہور۔ ایوب ناصر، کوئٹہ۔ فاطمہ جمیل، گجرات۔ ساجدہ حبیب، ساہی وال۔ ارم گل، جھنگ صدر۔ احور کامران، کنظیر۔ زہرہ، لاہور۔ عبدالناصر، گجرات۔ شاہ نور سید پور۔ ارحم خان، گوجرانوالہ۔ محمد عبداللہ، محمد احمد، لاہور۔ زل رانا، وزیر آباد۔ سامعہ منیر، لاہور۔ سعد خان، وزیر آباد۔ جاوید اقبال، کوئٹہ۔ ربیعہ نسرین، نادرہ زیدی، پشاور۔ شکیلہ نذیر، راول پنڈی۔ کشور ملک، اسلام آباد۔ یونس خان، فیصل آباد۔ جانفزا فاطمہ، ملتان۔ روحی اصغر، لاہور۔ بشریٰ نصیر، کامران اکمل، پیرمحل۔ جلیل خان، کراچی۔ ظلال خان، ساہی وال۔ قادر حسین، طاہر نذیر، جاوید نذیر، لاہور۔ سونیا اکرم، اسلام آباد۔ مومنہ خان، راولپنڈی۔ فیروز مغل، لاہور۔ قیوم نظر، تلہ گنگ۔ زہرہ فاطمہ، ندا فاطمہ، کراچی۔ ظل ہما، جھنگ۔ صوفیہ فرناز، مہناز، لاہور۔ سکینہ فاطمہ، خانیوال۔ شمیم ناز، شیخوپورہ۔ نسیمہ زہرہ، مخین آباد۔ عمران اصغر، لاہور۔ بینش آفاق، کراچی۔ روحیل اسلم، گوجرانوالہ۔ اویس اکمل، کاموکی۔ بینش اشرف، ساہی وال۔ وقار حسن، اسلام آباد۔ سلیم احسان، قصور۔ محمد اسلم، کوہاٹ۔ محمد نصیر، اسلام آباد۔ جاوید اقبال، نصیر آباد۔ محمد زاہد، ایبٹ آباد۔ طاہر بشیر، جہلم۔ محمد ارسلان، لاہور۔

میری زندگی کے مقاصد

حسنین جہانگیر، اوکاڑہ
میں پاک فوج میں جا کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

ارحم اللہ خان، حیدر آباد
میں ڈاکٹر بن کر اپنے ملک اور والدین کا نام روشن کروں گا۔

عمرہ ناصر، لاہور
میں سافٹ ویئر انجینئر بن کر ملک و قوم کی ترقی کے لیے کام کروں گی۔

سفرہ احسان، لاہور
میں معلمہ بن کر دین کی خدمت کروں گی۔

ثمرین فاطمہ، خانیوال
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

حسینہ زاہد، راولپنڈی
میں ایک فرماں بردار بیٹی بن کر ڈاکٹر بنوں گی۔

حافظ محمد الیاس عاجز، نور پور تھل
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

ہادیہ نفیس، گوجرانوالہ
میں استانی بن کر پاکستان سے جہالت ختم کروں گی۔

محمد طلحہ شفیق، لاہور
میں فوج میں جا کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

انشال انصاری، لاہور
میں پائلٹ بن کر ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

احمد یوسف، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

خیام حیدر، اٹک
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

ماریہ عبدالناصر، کلور کوٹ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

تحریم سرفراز، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

لیبا قیصر، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

محمد سلیم مغل، قصور
میں بڑا ہو کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

عبدالباسط، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

سعد احمد، فیصل آباد
میں ایکٹر بن کر مفید اور موثر موضوعات کی ترویج کر کے معاشرے کی اصلاح کروں گا۔

زینب عمران، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کی خدمت کروں گی۔

تاریخ کے جھروکوں سے

ایک دفعہ عباسی خلیفہ منصور نے اپنے وقت کے بہت بڑے عالم سے سوال کیا کہ ''جناب! نماز کے دوران مچھر مارنے سے نماز ٹوٹ تو نہیں جاتی؟'' تو میرے نبیؐ کے روحانی وارث نے عظیم اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے منصور سے کہا۔ ''اللہ اکبر! جس شخص کے ہاتھ پر کئی مسلمانوں کا خون ہے، وہ مجھ سے مچھر کے خون کی حرمت کے بارے میں سوال کرتا ہے۔'' خلیفہ شرمندہ ہو کر واپس چلا گیا۔

(ابرار الحق، رابعہ جنگ)

بہترین غلام

حضرت ابراہیمؒ بن ادھم نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا: ''تمہارا نام کیا ہے؟''

غلام نے جواب دیا: ''سرکار! غلام کا کیا نام ہوسکتا ہے؟ آپ جس نام سے پکاریں گے، وہی میرا نام ہوگا۔''

انہوں نے پوچھا: ''کھاتے کیا ہو؟''

جواب ملا: ''جو مالک عطا کر دے۔''

''پہنو گے کیا؟''

''جو آپ پہنائیں گے۔''

''اور کام؟''

''جو مالک حکم دے گا۔''

یہ سن کر حضرت ابراہیمؒ بن ادھم کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور فرمایا: ''کاش! میں بھی اپنے مالک کا ایسا ہی غلام بن سکتا۔''

(مومنہ شہزاد، راول پنڈی)

خیرات

''آپ مٹھی کو جتنا کس کے بند کریں گے، اس میں اتنی کم چیز آتی ہے۔ اگر مٹھی ڈھیلی بند کریں گے تو اس میں زیادہ آئے گا۔ تو خیرات دینے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم جتنا پیسہ کس کے رکھتے جائیں گے۔ اللہ میاں اس میں اتنی کمی کرے گا۔''

(رابعہ وحید تبسم، کلورکوٹ، بھکر)

سنہری باتیں

☆ آنسوؤں کا جاری نہ ہونا دل کی سختی کی وجہ سے ہے۔

☆ دل کی سختی گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ہے۔

☆ گناہوں کی کثرت موت کو بھولنے کی وجہ سے ہے۔

☆ موت سے غفلت بھی اُمیدوں کی وجہ سے ہے۔

☆ لمبی اُمیدیں دُنیا سے محبت کی وجہ سے ہے۔

☆ دُنیا سے محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔

(آمنہ سلام، اسلام آباد)

انمول ہیرے

☆ کسی کو درد دے کر یہ مت سوچو کہ تم کبھی خوش رہ سکو گے۔

☆ دُنیا و آخرت میں کام یاب ہونا چاہتے ہو تو والدین کی خدمت کرو۔

☆ باتوں کی بجائے عمل پر زور دو۔

☆ اگر قلبی سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو قرآن باقاعدگی سے پڑھو۔

☆ اگر عزت حاصل کرنا چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کرو۔

(مسفرہ عتیق، مریدکے)

دوست

☆ فضول بحث بہترین دوست سے جدا کر دیتی ہے۔

☆ تمہارا عیب بتانے والا تمہارا حقیقی دوست ہے۔

☆ ناقابل اعتماد دوست سے تنہائی بہتر ہے۔

☆ دوست کی محبت آزمانے کے بجائے اپنی محبت آزماؤ۔ جو اپنے دوست کو چھوڑتا ہے، وہ دشمن کو قوت دیتا ہے۔

☆ جب کوئی انسان کسی سے دوستی کرتا ہے تو گویا وہ دوست کا محافظ بن جاتا ہے۔

(قانتہ ریاض، کائنات ریاض، ماریا مرادن)

موتیوں جیسی باتیں

☆ اگر آپ کو کوئی اچھا لگے تو اچھا وہ نہیں، اچھے آپ ہیں کیوں کہ آپ اس میں اچھائی تلاش کرتے ہیں۔

☆ اگر آپ کو کوئی بُرا لگتا ہے تو پرواہ نہیں کیوں کہ بُرے آپ ہیں جو اس میں بُرائی تلاش کرتے ہیں۔

☆ ہمیشہ خوش رہو کیوں کہ یہ بہترین انتقام ہے ان لوگوں سے جو آپ کو غم میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ کام یاب لوگوں کے لبوں پر دو چیزیں ہوتی ہیں، خاموشی اور مسکراہٹ۔ خاموشی مشکلات سے بچنے کے لیے اور مسکراہٹ مشکلات کو حل کرنے کے لیے۔ (عائشہ صدیقہ، جہلم)

اقوالِ زریں

☆ زبان بند رکھنا ایک بہت بڑی عبادت ہے۔
☆ موت کی یاد انسان کو نیک بنا دیتی ہے۔
☆ دوست ہزار بھی کم، دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
☆ غم کو برداشت کرنا بھی عبادت ہے۔
☆ مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔
☆ کسی کا دل نہ دکھاؤ ایسا نہ ہو کہ اس کے آنسو تمہارے لیے سزا بن جائیں۔ (عدن سجاد، جھنگ)

قیمتی موتی

☆ نصیحت و عافیت کے ہوتے ہوئے زیادہ طلبی بھی شکوہ ہے۔
☆ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش کی نسبت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔
☆ لوگوں سے ملو تو اعمال کی بنا پر اور کٹو تو اعمال کی بنا پر۔
☆ جب عقل کامل ہو جاتی ہے تو بولنا کم ہو جاتا ہے۔
☆ اللہ کے نزدیک بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا خیر خواہ ہو۔
☆ طاقت ور وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے، طاقت ور وہ ہے جو غصے میں اپنے آپ پر قابو رکھے۔
☆ ہمیشہ حق اور سچی بات کہو، اگرچہ کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔
(فہد شاہ، نوگزی مانسہرہ)

جہاں پناہ

افلاطون کی شہرت جب یونان سے باہر نکلی تو ایک پڑوسی ملک کے بادشاہ نے اسے اپنے دربار میں بلا کر کتاب ”جمہوریت“ کی بہت تعریف کی اور فرمائش کی کہ افلاطون اس ملک کے لیے بھی کوئی آئینی خاکہ تیار کرے اور ملک چلانے کے گر بتائے۔

افلاطون نے شاہی فرمان کے مطابق مہمان بن کر کام شروع کر دیا۔ پانچ ماہ بعد بادشاہ نے عظیم فلسفی کو دربار میں بلوایا اور پوچھا۔ ”تم نے ہمارے ملک کے لیے جمہوری و دستوری خاکہ تیار کیا ہے یا نہیں؟“

افلاطون نے عرض کیا: ”خاکہ تو میں نے تیار کر لیا ہے مگر اس میں جہاں پناہ کہیں نظر نہیں آتے۔“

بھکاری

گھر کے دروازے پہ کر کے چاند ماری خواہ مخواہ
آ گیا ہے مانگنے کوئی بھکاری خواہ مخواہ
واسطہ دیتا ہے اپنی بھوک اور افلاس کا
کر کے شامل اس میں اپنی گریہ زاری خواہ مخواہ
دس روپے کے نوٹ سے کم بھیک وہ لیتا نہیں
منہ بناتا ہے اگر دیں ریزگاری خواہ مخواہ
ہاتھ خالی لے کے گھر سے یہ نکلتا ہے غریب
لوٹتا ہے کر کے اپنی جیب بھاری خواہ مخواہ
صبح دم رکھتا نہیں کیسہ میں اک پیسہ مگر
شام کو ہوتا ہے وہ اٹھارہ ہزاری خواہ مخواہ
جانتا ہے مانگنے کا اک سے اک اعلیٰ ہنر
نت نئے ناٹک رچائے یہ مداری خواہ مخواہ
بینک کا عملہ اسے جو دیکھ لے آتے ہوئے
دوڑتا ہے تھامنے اس کی پٹاری خواہ مخواہ
لال بتی پہ کھڑے سائل کو جب آواز دی
درجنوں آئے نکل اس کے حواری خواہ مخواہ
دیکھتا ہوں جب کسی کشکول والے کو ضیاء
دل پہ لگ جاتا ہے کوئی زخم کاری خواہ مخواہ
(شرافت ضیاء، اسلام آباد)

الٰہ آباد سے......

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو آم بہت پسند تھے۔ ایک مرتبہ ان کے دیرینہ دوست اکبر الٰہ آبادی نے ان کے لیے لنگڑے آم کی پیٹی بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی رسید میں ایک شعر لکھ بھیجا:

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک آیا
(شفق فاطمہ، راول پنڈی)

انمول موتی

☆ بن مانگے ملنے والی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو، بے شک یہ شکر کی عادت ہی ہے جو تم پر پڑنے والی مصیبتوں کا رستہ روکتی ہے۔
☆ طنز اور بحث سے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ بس کبھی بھی اپنوں سے ایسی لڑائی نہ لڑنا کہ لڑائی تو جیت جاؤ مگر اپنوں کو ہار جاؤ۔
(نازل سویرا، لاہور)

اچاری ونگز

اجزاء:

چکن ونگز: ایک کلو ۔ نمک: حسب ذائقہ ۔ ادرک، لہسن پسا ہوا: ایک کھانے کا چمچ ۔ پیاز: تین عدد
ٹماٹر: تین عدد ۔ دہی: ایک پیالی ۔ سرخ مرچ: آدھا کھانے کا چمچ ۔ سفید زیرہ: ایک کھانے کا چمچ
ثابت دھنیا: ایک کھانے کا چمچ ۔ سونف: آدھا چائے کا چمچ ۔ ثابت رائی: آدھا چائے کا چمچ ۔ کلونجی: آدھا چائے کا چمچ
میتھی دانہ: آدھا چائے کا چمچ ۔ کڑی پتا: تین عدد ۔ تیل: آدھی پیالی

ترکیب:

دھنیا، زیرہ، رائی، کلونجی، میتھی دانہ اور سونف توے پر بھون لیں اور پیس لیں۔ ادرک، لہسن کو سرخ مرچ کے ساتھ ملائیں۔ اس پیسٹ کو مسالہ میں ملا دیں۔ اسی میں دہی شامل کر دیں۔ اس پیسٹ کو ونگز پر لگائیں اور تھوڑی دیر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ گرم تیل میں کڑی پتا ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر پیاز ڈال کر بھونیں، تھوڑی دیر بعد ٹماٹر ڈال دیں۔ پھر مسالہ لگے ونگز ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ تیل اوپر آجائے تو مزے دار چکن ونگز تیار ہیں۔

چیری چکن

اجزاء:

چکن: آدھا کلو ۔ چیری: دس عدد ۔ نمک: حسب ذائقہ ۔ ادرک پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ
کالی مرچ: ایک چائے کا چمچ ۔ سویا ساس: دو کھانے کے چمچ ۔ چلی ساس: دو کھانے کے چمچ ۔ تل: دو کھانے کے چمچ
میدہ: دو کھانے کے چمچ ۔ تیل: چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

چکن کو نمک، ادرک، کالی مرچ، سویا ساس، چلی ساس، تل، میدہ اور تیل سے اچھی طرح میرینیٹ کر کے رکھ لیں۔ ایک پین میں ایک پیالی پانی ڈال کر اُبال آنے دیں۔ پھر اس میں میرینیٹ کیا چکن ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ مناسب گاڑھا ہونے پر چیری ڈال کر پیش کر دیں۔ مزیدار چیری چکن تیار ہے۔

چاکلیٹ ایکلیئرز

اجزاء:

میدہ: ایک پیالی ۔ انڈے: تین عدد ۔ پانی: ایک پیالی ۔ فریش کریم: ایک پیالی
چینی: چار سے چھ کھانے کے چمچ ۔ کوکنگ چاکلیٹ: حسب پسند ۔ تیل: آدھی پیالی

ترکیب:

پانی میں تیل ڈال کر اُبال آنے تک پکائیں، پھر میدہ ڈال کر لکڑی کے چمچ سے اتنی دیر بھونیں کہ میدہ اچھی طرح خشک ہو جائے تو چولہے سے اُتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ پھر اس میں انڈے شامل کر کے اچھی طرح سے پھینٹ لیں۔ اس مکسچر کو کون کے ذریعے چکنی کی ہوئی ٹرے میں ڈالیں اور 200 ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم کیے اوون میں سنہری کر کے نکال لیں۔ کوکنگ چاکلیٹ کو پگھلا کر اس میں ٹھنڈی کی ہوئی کریم میں چینی کے ساتھ ملا کر پھینٹ لیں۔ ایکلیئرز میں چھوٹا سا کٹ لگا کر یہ آمیزہ ملا دیں...... ٹھنڈا کر کے نوش کریں۔

دانہ بوٹی

دانہ بوٹی دُنیا کا سب سے چھوٹا پھول دار پودا ہے۔ اس کا سائنسی نام "Wolffia Arrhiza" ہے۔ اس کا تعلق "Araceae" خاندان سے ہے۔ یہ یورپ، افریقہ اور براعظم ایشیاء کے چند علاقوں میں قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ آبی پودا ہے جو تالابوں میں اُگتا ہے۔ پودے کا سبز حصہ "Frond" کہلاتا ہے جو صرف ایک ملی

میٹر چوڑا ہے۔ اس پودے کی جڑ نہیں ہوتی۔ یہ ننھا سا پودا پھول پیدا کرتا ہے جس میں صرف ایک "Stamen" اور ایک "Pistil" ہوتی ہے۔ یہ چھوٹا سا پودا غذائیت کا خزانہ ہے۔ پودے کا سر سبز حصہ پروٹین، سٹارچ، کیلشیم، میگنیشیم، زنک اور وٹامن B سے بھرپور ہوتا ہے۔ برما، لاؤس، تھائی لینڈ اور تائیوان کے لوگ اس پودے کو ''پانی کے انڈے'' پکارتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں۔ خشک ہونے پر یہ خشخاش کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنہیں بھون کر کھایا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ کے لوگ انہیں خشک کر کے مرغیوں کی فیڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس پودے ایک پودے کا وزن 150 سے 200 مائیکروگرام ہوتا ہے۔

مشین گن

مشین گن "Machine Gun" ایک آٹومیٹک گن ہے جو یک دم گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہے کیوں کہ اس میں گولیوں سے بھری میگزین ڈالی جاتی ہے۔ ٹریگر دبانے پر بیک وقت بارش کی طرح گولیاں نکلتی ہیں۔ لگ بھگ ایک منٹ میں 300 سے 2000 تک گولیاں دشمن کو چھلنی کر دیتی ہیں۔ اس گن کو بآسانی ایک سے دوسری جگہ پر لے جایا جا سکتا ہے۔ ہلکی اور سب مشین گن بھی متعارف کروائی جا چکی ہیں۔ اس خود کار گن کو ہاتھ میں پکڑ کر، مورچے یا بنکر سے گولیاں فائر کی جا سکتی ہیں۔ ابتدائی طور پر انہیں جنگِ عظیم اوّل میں استعمال کیا گیا۔ بعدازاں دوسری جنگِ عظیم میں جدید مشین گن سے لڑائی لڑی گئی۔ جدید مشین گن کی دو ٹانگیں (Bipod) ہوتی ہیں، تاہم تین ٹانگوں (Tripods) گن بھی ملتی ہیں تاکہ فائرنگ کے وقت توازن قائم رہے۔

M-240, G-3, M-16, AK-47 دنیا کی مشہور و معروف مشین گنیں ہیں۔ پاکستان میں اسلحہ ساز فیکٹری واہ کینٹ میںSMG کے نام سے مشین گن بنائی جاتی ہے جو ایک منٹ میں 900 سے 1000 گولیاں پھینکتی ہے۔

الخوارزمی

محمد ابنِ موسیٰ الخوارزمی عظیم مسلمان سائنس دان کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں روس نے (1200 ویں سال گرہ کا دن) 6 ستمبر 1983ء کو یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ آپ کی پیدائش 780ء اور وفات 850ء میں ہوئی۔ آپ کا تعلق خوارزم، ایران سے تھا۔ البتہ علم کی تلاش اور سائنسی تحقیق کے لیے آپ نے عراقی شہر بغداد کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ نے ریاضی اور الجبرا کو الگ الگ کیا۔ ریاضی پڑھنے والے الگورتھیم پڑھتے ہیں جو لاطینی

زبان میں الخوارزمی کے نام سے ماخوذ ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے فلکیات(Astronomy)، ٹرگنومیٹری(Trignometry)، جغرافیہ(Geography) کے عنوانات و مضمون پر کتابیں بھی لکھیں۔ ایران کے صدر مقام تہران کی امیر کبیر یونیورسٹی برائے ٹیکنالوجی کے مرکزی دروازے پر الخوارزمی کا مجسمہ نصب ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں الخوارزمی بلاک، الخوارزمی روڈز اور الخوارزمی کلب قائم ہیں۔

تیراندازی

تیراندازی (Archery) ایک کھیل اور فن ہے جس میں تیرانداز (کھلاڑی) کمان (Bow) کی مدد سے تیر (Arrows) نشانے پر لگاتا ہے۔ Archery کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ "Arcus" سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ''لڑائی، شکار'' وغیرہ۔

کسی زمانے میں یہ جنگی ہتھیار تھا لیکن اب تیراندازی ایک کھیل(Sport) ہے۔ تیرانداز کو "Toxophilite" کہا جاتا ہے۔ تیراندازی کی ابتداء 10,000 برس قبل ہوئی جب انسان شکار کر کے رزق حاصل کرتا تھا۔ ماضی میں لکڑی سے بنے تیر کمان استعمال ہوتے تھے لیکن اب دھاتی تیر کمان استعمال کیے جاتے

ہیں۔ یورپ، چین، ایشیاء، مصر، انڈیا، جاپان، کوریا، ترکی اور عرب کی تاریخ بتاتی ہے کہ تیروں کو شکار کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ تاہم 1840ء کی دہائی میں کھیل کی شکل دے دی گئی۔ 1900ء میں پیرس کے اولمپک کھیلوں میں تیراندازی کا مقابلہ منعقد ہوا۔ کمان اور تیر کئی اشکال کے ہوتے ہیں۔ کھلاڑی آرم گارڈ یاBracer استعمال کرتے ہیں تاکہ کمان سے نکلتا تیر ہاتھ کو نقصان نہ پہنچا سکے اور ہاتھ زخمی نہ ہو۔ انگلی کے پاس مکینیکل Release Aid بھی لگائی جاتی ہے تاکہ تیر تیزی سے نکلے۔ World Archery Federation اس کھیل کے قوانین متعین کرتی ہے۔ اس کا دفتر سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ ☆☆☆

فٹ بال کے دو کھلاڑی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بولا: ''میں نے ایک دن فٹ بال اتنی اُونچی پھینکی کہ پورے دو گھنٹے بعد واپس آئی۔''
دوسرا بولا: ''یہ تو کچھ بھی نہیں، میں نے ایک دن فٹ بال اتنی اُونچی پھینکی کہ وہ دو دن بعد واپس آئی اور اس کے ساتھ ایک پرچی بھی تھی جس پر لکھا تھا کہ یہ فٹ بال آئندہ چاند پر نہ آئے۔'' (اریان، راجہ جنگ)

گاہک (دُکان دار سے): ''یہ والی ٹائی کتنے کی ہے؟''
دُکان دار: ''اڑھائی سو کی۔''
گاہک: ''بھائی! کچھ تو کم کرو، اڑھائی سو میں تو چپل کی جوڑی آجاتی ہے۔''
دُکان دار: ''بس پھر ٹھیک ہے، آپ چپل لے کر گلے میں لٹکا لیں۔''
(تقویٰ خلیق راجہ، واہ کینٹ)

راہ گیر (لڑکے سے): ''کیوں میاں! کیا ابھی تک کھویا ہوا نوٹ تلاش کر رہے ہو؟''
''جی نہیں، نوٹ تو میرے چھوٹے بھائی کو مل گیا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔
راہ گیر نے حیرت سے پوچھا: ''پھر اب کیا تلاش کر رہے ہو؟''
لڑکے نے کہا: ''چھوٹے بھائی کو۔'' (محمد مصحف الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان)

اُستاد (شاگرد سے): ''کرکٹ کا بلا کس کام آتا ہے؟''
شاگرد: ''کپڑے دھونے کے کام آتا ہے۔'' ☆

میاں (بیوی سے): ''تم ایک گھنٹے سے دروازے پر کھڑی کس سے باتیں کر رہی ہو؟''
بیوی: ''وہ میری دوست تھی، بے چاری کے پاس اندر آنے کا ٹائم ہی نہیں تھا۔'' (الینا قیصر، راول پنڈی)

مریض (ڈاکٹر سے): ''مجھے ہچکیاں بہت آتی ہیں۔''
ڈاکٹر: ''کوئی یاد کرتا ہوگا۔''
مریض: ''مجھے یاد کرنے والے سب مر گئے۔''
ڈاکٹر: ''لیکن میں تو ابھی زندہ ہوں۔'' ☆

باپ (بیٹے سے): ''بیٹا! دیکھو، میں تمہیں شریر لڑکوں کی صحبت سے دُور رکھنا چاہتا ہوں۔''
بیٹا: ''ابا جان! اسی لیے میں اسکول نہیں جاتا۔'' (ثروت یعقوب، لاہور)

منو میاں ایک روز بڑے خوش خوش اسکول سے واپس آئے اور بولے: ''ممی میں کلاس میں سب سے اچھا بچہ ہوں۔''
''بہت خوب!'' امی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بات تمہیں ٹیچر نے بتائی ہے؟''
''نہیں ممی! میں نے خود ہی اندازہ لگایا ہے۔'' ☆

ایک صاحب بینائی کمزور ہونے کے باوجود شکار کے بے حد شوقین تھے۔ ایک دن وہ اپنے دوست کے ساتھ شکار پر گئے۔ جنگل میں شکار کے دوران اچانک ان صاحب کے سامنے کوئی چیز آئی تو انہوں نے اس پر فائر کھول دیا اور اپنے دوست سے پوچھا:
''یہ جو میں نے جانور شکار کیا ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟''
''اس جانور کو درخت کہتے ہیں۔'' دوست نے جواب دیا۔ ☆

ایک بچہ روتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ ماں نے رونے کی وجہ پوچھی تو بچے نے کہا: ''ابا جان دیوار میں کیل گاڑ رہے تھے تو ان کے ہاتھ پر ہتھوڑی لگ گئی۔''
ماں بولی: ''بیٹا! بہادر بچے ذرا سی بات پر روتے نہیں، تمہیں تو ہنسنا چاہیے تھا۔''
بچے نے کہا: ''امی ہنسا ہی تو تھا۔'' ☆

ایک مرتبہ برطانوی وزیراعظم چرچل ایک پاگل خانے کے دورے پر گئے، جیسے ہی پاگل خانے کے مرکزی دروازے سے اندر جانے لگے تو ایک پاگل صحت مند ہونے کے بعد گھر جانے کے لیے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے چرچل نے کہا: ''مجھ سے ملو، میں برطانیہ کا وزیراعظم ہوں۔''
اس نے چرچل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''فکر نہ کرو، جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں جب یہاں آیا تھا تو میں بھی یہی کہتا تھا۔'' ☆

بیوی (شوہر سے): ''آپ کو تو میرا بنایا ہوا حلوہ اچھا نہیں لگتا۔ بچے تو تین پلیٹیں ختم کر چکے ہیں۔''
اندر سے آواز آئی: ''امی! ایک پلیٹ اور حلوہ دیں، دو کتابوں کی جلدیں رہتی ہیں۔''
☆☆☆

اصغر کی امی اکثر دوسرے چوتھے روز کچھ پیسے اُسے دے کر کہتیں کہ "یہ پیسے چپکے سے مُلّا جی کے ہاتھ میں دے دینا۔" وہ بھی خاموشی سے لے کر جیب میں ڈال لیتے اور کبھی نہ پوچھتے کہ یہ کیسے پیسے ہیں؟

ایک دن اصغر نے پوچھ ہی لیا کہ "امی! آپ مُلّا جی کو روز روز یہ کیسے پیسے بھیجتی ہیں؟"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا! یہ صدقے خیرات کی رقم ہوتی ہے، مُلّا جی کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور وہ غریب آدمی ہیں۔ گزر بسر مشکل سے ہوتی ہوگی، اسی لیے میں یہ صدقہ وخیرات کے پیسے اُنہیں بھیج دیتی ہوں تاکہ اُن کے کام آسکیں۔"

قریب ہی اصغر کی چھوٹی بہن بیٹھی ہوئی اسکول کا کام کر رہی تھی۔ ماں کی بات سن کر بولی:

"امی! یہ صدقہ وخیرات کیا ہے؟"

"بیٹی! اللہ کے نام پر جو کچھ کسی محتاج کو دیں، اُسے صدقہ اور خیرات کہتے ہیں۔" ماں نے جواب دیا۔

"تو اس سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟" اصغر نے پوچھا۔

"بیٹا! اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہمارے سر سے ہر قسم کی الا بلا ٹل جاتی ہے۔"

پاس ہی اصغر کا بڑا بھائی انور بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ ہر بات میں ہنسی مذاق کا پہلو نکال لیتا تھا۔ ماں کی بات سن کر بولا:

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے سر سے الا بلا ٹال کر مُلّا جی کے سر ڈال دیتے ہیں یعنی الا بلا بہ گردنِ مُلّا!

انور کی بات پر سب ہنسنے لگے۔

بچو! اس مثل کا مفہوم یہ ہوا کہ جب اپنی کوئی مصیبت کسی کمزور آدمی کے سر منڈھ دی جائے تو کہتے ہیں کہ یہ خوب رہی کہ الا بلا بہ گردنِ مُلّا۔

بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں ایک حکیم علیم الدین انصاری تھے۔ بے حد ذہین و فطین شخص تھے۔ صرف بیس برس کی عمر میں انہوں نے عربی اور فلسفے کی تعلیم مکمل کی اور علم طب پر عبور حاصل کیا۔ علیم الدین انصاری بنیادی طور پر چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں لاہور آئے، پھر دہلی چلے گئے۔ وہاں سے آگرہ جا کر اپنا مطب کھولا۔ پھر مغل دربار تک رسائی حاصل ہوئی اور وہ شہزادوں اور ان کی بیگمات تک کے معالج بن گئے۔ شہزادہ خرم ان کے علم کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ یوں وہ جلد ہی شاہی لوگوں کے قریب ہو گئے۔ لاہور کی مشہور مسجد وزیر خاں حکیم علیم الدین انصاری نے ہی تیار کرائی تھی۔ اس مسجد کا شمار دُنیا کی خوب صورت ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ مسجد کا حسن و جمال آج چار صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی زائرین اور سیاحوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ حکیم علیم الدین انصاری کو ان کی خدمات اور قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کی طرف سے نواب وزیر خاں کا خطاب دیا گیا تھا۔ جن دنوں مسجد وزیر خاں کی تعمیر شروع ہوئی، ان دنوں نواب وزیر خاں صوبہ پنجاب (مشرقی و غربی) کے گورنر تھے۔ اس زمانے میں جہانگیر کی ملکہ نور جہاں ایک مرض "عرق النساء" کا شکار ہو گئیں۔ بہت زیادہ علاج کرایا گیا مگر درد سے آرام نہ آیا۔ حکیم علیم الدین انصاری کی شہرت کا سن کر بادشاہ نے انہیں بلوایا۔ حکیم صاحب شاہی بلاوا سن کر پریشان نہ ہوئے بلکہ اللہ کے حضور رو رو کر دُعا کی اور مریض کی شفایابی کے لیے منت مانی۔ حکیم انصاری نے اللہ کے حضور یہ منت مانی کہ اگر میرے علاج اور تیرے حکم سے شفایابی ہوئی تو انعام و اکرام کے طور پر جو بھی رقم ملے گی، وہ میں صرف تیرے گھر کے لیے رکھوں گا اور ایک مسجد تعمیر کراؤں گا کیوں کہ صرف تیری ذات مقدس ہی شفا بخش سکتی ہے اور کوئی نہیں۔

ملکہ کی نبض دیکھنے کے بعد انہوں نے مرض کی تشخیص کی۔ اللہ کی قدرت کہ حکیم صاحب کے علاج سے ملکہ صحت یاب ہونا شروع ہو گئیں۔ جب وہ تندرست ہو گئیں تو انہوں نے حکیم صاحب کو ایک لاکھ روپے کا بیش قیمت خلعت مرحمت فرمایا اور اس کے ساتھ سات لاکھ روپے نقد دیئے جو اس زمانے کے حساب سے ایک بہت بڑی رقم تھی۔ ملکہ نور جہاں اپنی صحت یابی پر اتنی خوش تھیں کہ جتنا زیور پہنے ہوئے تھیں، اُتار کر حکیم صاحب کو دے دیا۔ حرم کی بیگمات اور شاہی کنیزوں نے یہ دیکھا تو ان سے بھی رہا نہ گیا اور انہوں نے بھی اپنے تمام زیورات اُتار کر ملکہ کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔ ملکہ نے تمام زیورات اُٹھائے اور حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

حکیم علیم الدین انصاری نے تمام انعامات کی قیمت لگوائی تو یہ تقریباً 22 لاکھ روپے بنی۔ حکیم صاحب نے اس پر اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل پڑھے اور لاہور میں مغلیہ فنِ تعمیر کی طرز پر ایک عالی شان مسجد بنوانے کی بنیاد رکھی جس کا نام مسجد وزیر خاں رکھا گیا۔

حکیم نواب وزیر خاں (حکیم علیم الدین انصاری) ایک نیک نیت، پاک دل اور سازشوں سے دُور رہنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں اپنے دورِ اقتدار کو بھی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا۔ چناں چہ انہی اوصاف کی بنا پر دربار کے امراء و وزراء ان کے گرویدہ ہو گئے۔

یہ نواب وزیر خاں کی پرہیزگاری اور اپنے اللہ پر یقین کی بات تھی کہ ایک دن میں اس زمانے کے 22 لاکھ روپے حاصل کیے۔ انہوں نے نماز کبھی سنت غیر مؤکدہ کے بغیر ادا نہ کی۔ نواب وزیر خاں نے اپنی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ کام کیا۔ انہوں نے پنجاب کی نظامت کے سات سال احسن طریقے سے خدمات انجام دیں۔ مسجد وزیر خاں کے علاوہ مختلف مساجد، حمام، بازار، محلات، باغ اور بارہ دری بنوائیں۔ یہ پڑھ کر یقیناً آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا کہ چھریوں اور چاقوؤں کے لیے مشہور وزیر آباد شہر بھی انہوں نے ہی بسایا تھا۔ آج کی پنجاب پبلک لائبریری کے پاس انہوں نے اپنا ایک وسیع باغ تعمیر کرایا تھا جس کا نام نخلستان وزیر خاں تھا۔ باغ کے درمیان میں ایک بارہ دری تھی جس کے چاروں طرف بلند چبوترہ تھا۔

مسجد وزیر خاں لاہور کے دہلی دروازہ، اکبری دروازہ اور کشمیری دروازہ کے سنگم میں تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مسجد کی تعمیر کے لیے علماء کرام، بہترین معماروں اور کاشی کاروں کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ماہر خطاطوں کی خدمات سے بھی استفادہ کیا گیا۔ مسجد دو ہزار مربع فٹ کے رقبے پر محیط ہے۔ مسجد کے چار دروازوں میں صدر دروازہ 19 فٹ اونچا اور 21 فٹ چوڑا ہے۔ صحن 175 فٹ 118 انچ لمبا اور 94 فٹ 9 انچ چوڑا ہے۔ مسجد کے چاروں کناروں پر ہشت پہلو مینار ہیں جن میں ہر ایک کی بلندی تقریباً 85 فٹ ہے۔ مسجد کے اندرونی پانچ گنبدوں میں سے درمیانی گنبد 24 فٹ قطر کا ہے۔ وسط میں ایک بڑا تالاب ہے، جس کی لمبائی اور چوڑائی 34 فٹ 6 انچ ہے۔

مسجد وزیر خاں کے مشرقی دروازے میں داخل ہوں تو چینی نقاشی کا انتہائی نفیس کام دیکھنے کو ملے گا۔ یہ دروازہ مختلف رنگوں کی روغنی ٹائلوں کو جوڑ کر خاص شکل میں بنایا گیا ہے۔ محققین کے مطابق نقاشی کے فن کی ابتدا چین سے ہوئی۔ وہاں سے یہ فن ایران اور پھر ہندوستان آیا۔ اس فن کے کاریگر شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان لائے گئے۔ مسجد کے اندر بھی عمدہ رنگین نقاشی مسجد کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ مسجد کو اعلیٰ خطوط سے مزین کرنے کے لیے خطاطوں کی خدمات بھی لی گئیں۔

مسجد میں جگہ جگہ محرابوں میں طاقچے رکھے گئے جن پر خطاطی

کے لیے علماء کرام نے آیات کریمہ، احادیثِ مبارکہ اور مختلف اقوال منتخب کیے۔ نیشنل کالج آف آرٹس کے طالب علم اس مسجد کے طاقچوں کے نمونے مشق کے لیے بناتے ہیں۔ نیشنل کالج آف آرٹس کو قیامِ پاکستان سے پہلے میو اسکول آف آرٹس کہتے تھے۔ اس کے پرنسپل مسٹر جے ایل کپلنگ نے ایک رپورٹ تحریر کی جس میں لکھا کہ ”یہ خوب صورت عمارت کیا ہے، فن نقاشی کا بہترین اسکول ہے مگر افسوس یہ لوگ اس کی صحیح دیکھ بھال نہیں کرتے۔ لوگوں کا رجحان اس طرف کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نقش و نگار آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو اندیشہ ہے کہ یہ عدیم المثال نمونے زمانہ کے ہاتھوں نیست و نابود ہو جائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے صحیح صحیح چربے اُتار کر لاہور کے عجائب گھر اور اسکول میں محفوظ کر دیے جائیں کیوں کہ ہمارے نوجوان مصوروں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم نہیں ہوسکتی۔“

ماہر خطاطوں نے مسجد میں موجود طاقچوں اور محرابوں کے لیے رسم الخطوں کا انتخاب کیا۔ مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی تو اس پر بہت محنت اور خوب صورتی سے کاشی کاری اور خطاطی کا کام کیا گیا۔ اس دور کے نامور خطاط محمد علی، ملا محمد حسین اور محمد شریف کاشمیری کا انتخاب نواب وزیر خاں کی طرف سے کیا گیا۔ پھر ان تمام ماہر نقاشوں، خطاطوں، فریسکو اور ماہرین نے اپنی محنت سے مسجد کو بلاشبہ ایک لازوال شاہکار کی شکل دے دی۔

مسجد وزیر خاں ایک دور میں نماز پنجگانہ، جمعہ اور عیدین کی نماز کے علاوہ علمی و ادبی حلقوں اور شعراء کے لیے ایک بڑا ثقافتی مرکز بھی تھی۔ یہاں نعت خوانی کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ مسجد کے نیچے کھانے پینے کا سامان، خطاطوں کی خطاطی اور نادر کتب بھی فروخت ہوتی تھیں۔ مسجد کے باہر مشرق کی جانب ایک وسیع سرائے تھی جسے چوک وزیر خاں کا نام دیا گیا۔ اس کے تین محرابی دروازے اور چوک میں دو گنبد ہیں۔ ایک گنبد خانقاہ حضرت سید صوف کا، دوسرا راجہ دینا ناتھ کے کنویں کا۔ اس کے قریب ہی حضرت سر بلند کا مزار ہے۔ سید صوف اور حضرت سر بلند دونوں بزرگوں کے مزار مسجد کی تعمیر سے پہلے موجود تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا انتقال فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہوا تھا۔

1953ء سے پہلے اس چوک کا ماحول عجیب تھا۔ تنگ بازار اور کھپریل کی کچی دکانیں تھیں جہاں دودھ، دہی اور قلفہ فروخت ہوتا تھا۔ مکھیوں کی بھن بھناہٹ اور مچھیروں کی مچھلیوں کی بدبو سے یہاں سے گزرنا محال ہو جاتا تھا۔ چوک میں ملبے اور کوڑے کے ڈھیر مختلف جانوروں کی آماجگاہ ہوتے تھے۔ مسجد کے زیرِ سایہ اور بدتر حال تھا۔ بغل بندوں اور آہن گروں کی بھٹیوں نے دیواریں تک سیاہ کر دی تھیں۔ پھر شہری انتظامیہ نے 1953ء کے بعد اس طرف توجہ دی اور آہستہ آہستہ صفائی ہونے سے حالات بہتر ہونا شروع ہوئے۔

مسجد کے اندر اور باہر کاشی کاری اور نقاشی کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ مسجد کے چار دروازے ہیں۔ چوک کی طرف سے مشرقی دروازے پر، اُوپر سے نیچے تک کاشی کا نفیس کام نظر آتا ہے۔ مسجد کے صحن میں ایک سو مربع گز کا حوض ہے جہاں نمازی وضو کرتے ہیں۔ قریب ایک تہہ خانہ ہے جہاں بزرگ حضرت میراں شاہ کا مزار ہے۔ تین اطراف میں حجرے ہیں۔ مسجد کی عمارت پانچ محراب دار، درون اور گنبددار چھت پر مشتمل ہے۔ محرابوں پر قرآن پاک کی آیات اور احادیث درج ہیں۔ درمیانی محراب پر آیت الکرسی خط نسخ میں لکھی گئی ہے۔ باقی کتبوں پر صحابہ کرامؓ کے نام درج ہیں۔ صحن کے چاروں کونوں پر چار خوب صورت مینار ہیں جن کے چوکھٹوں پر کاشی کا کام نفاست کی عمدہ مثال ہے۔ مسجد کے باہر بیرونی دروازے پر کلمہ طیبہ، اشعار اور مسجد کی تاریخ درج ہے۔

یہ مسجد اس قدر پختہ، بہترین مسالے اور پرہیزگار کاریگروں کے ہاتھوں سے بنی ہے کہ ساڑھے تین سو برس گزرنے کے باوجود اسے کسی خاص مرمت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے نقش و نگار آج بھی اسی طرح قائم ہیں جیسے صدیوں پہلے تھے۔ دیواروں پر ابھی بھی کاشی کا کام نظر آتا ہے۔

مسجد کے اردگرد تمام تجاوزات، ٹھیلوں کو ہٹا دیا گیا ہے اور مسجد وزیر خان کے علاوہ اردگرد کی دیگر تاریخی عمارتوں کی مرمت و تزئین کی گئی ہے۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ان تمام ورثوں کو محفوظ کرنے کی مزید کوششیں ابھی جاری ہیں۔

☆☆☆

''شاید ابھی نہیں۔'' عامر نے بھائی کی بات کا جواب دیتے ہوئے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی پنسل ٹارچ کی ننھی سی کرن روشن دان پر پڑ رہی تھی۔ سارا کمرا بڑے بڑے بکسوں اور پیٹیوں سے، چھت تک بھرا پڑا تھا اور ان پر مختلف کمپنیوں کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ ریڈیو، ٹی وی اور وی سی آر کے علاوہ بجلی کے سامان کی پیٹیاں بھی تھیں، جنھیں باہر لگے ہوئے لیبلوں سے انہوں نے پہچانا۔

''کم بختوں نے چوری کا کتنا مال جمع کر رکھا ہے۔'' عمار بولا۔

اتنے میں سارے ڈاکو دھڑا دھڑ سیڑھیوں پر سے اُترے اور دروازہ بند پا کر اسے زور زور سے دھڑ دھڑانے لگے۔ عامر بکسوں پر پیر رکھ رکھ کر روشن دان تک پہنچ گیا۔ عمار اسے روشنی دکھا رہا تھا۔ اوپر پہنچ کر اس نے روشن دان کے گرد آلود شیشوں کو مکے مار مار کر توڑ دیا۔ ادھر ڈاکوؤں نے بھی دروازے کو مکوں اور ٹھوکروں سے توڑ لیا تھا۔ جب عمار نے دیکھا کہ لکڑی کا مضبوط پٹ اب کوئی دم میں ٹوٹا ہی چاہتا ہے تو وہ بھی لپک کر عامر کے پیچھے بکسوں پر چڑھتا ہوا روشن دان تک جا پہنچا۔ اتنے میں ڈاکو بھی دروازہ توڑنے میں کام یاب ہو چکے تھے۔ پولارڈ آگے آگے تھا۔

''وہ دیکھو! وہ روشن دان سے اس طرف کی چھت پر نکل رہے ہیں۔'' وہ چلّایا اور جلدی سے خود بھی عمار کے پیچھے بکسوں پر چڑھ گیا۔ اس نے عمار کی ٹانگ پکڑنا چاہی لیکن عمار نے روشن دان کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ کر ایسی زور دار لات رسید کی کہ ڈاکو کے پاؤں تلے سے پیٹی نکل گئی اور بہت سے بکس لڑھکتے ہوئے دوسرے ڈاکوؤں پر آن گرے۔

ادھر عامر اور عمار اوپر پہنچ کر نیچے اُترنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ یہ بہت کھلی چھت تھی۔ وہ منڈیر کی طرف دوڑے تاکہ پرنالے کے پائپ کی مدد سے نیچے اُتریں مگر جھک کر پائپ کا جائزہ لیا تو وہ زمین سے بیس پچیس فٹ اوپر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اتنی بلندی سے نیچے چھلانگ لگانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تاکہ کوئی اور راستہ تلاش کریں۔ اِدھر ڈاکو بھی بڑے سخت جان نکلے۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کی پروا کیے بغیر روشن دان کے راستے ہی ایک ایک کر کے اوپر آ گئے۔

''کدھر گئے وہ لڑکے؟'' ایک نے کہا۔

''جائیں گے کہاں۔ یہیں کہیں ہوں گے۔'' دوسرا بولا۔

چھت پر ٹوٹا پھوٹا بہت سامان پڑا تھا۔ لڑکے اس کی اوٹ میں چھپ گئے تھے۔

''مل جائیں تو انہیں پکڑ کر یہیں سے نیچے پھینک دو۔'' یہ پولارڈ کی آواز تھی۔

''سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس درخت کی شاخوں کو پکڑ کر نیچے پہنچیں۔'' عامر نے تجویز پیش کی۔

''مگر شاخیں تو کافی دُور ہیں، چھت سے۔'' عمار نے کہا۔

''واحد راستہ یہی ہے، ہمت کرو۔'' عامر نے کہا اور ہوا میں جست لگا دی۔

''وہ رہے! پکڑو! دوڑو!'' کی آوازیں آئیں اور سب ڈاکو دوڑ پڑے۔ انہیں قریب آتے دیکھ کر عمار نے بھی چھلانگ لگائی اور عامر کی طرح درخت کی شاخ کو پکڑ لیا۔ دونوں نے شاخوں پر جھول کر ایک موٹی ٹہنی پر قدم جمائے اور باری باری نیچے زمین پر اُتر آئے۔ پولارڈ نے اپنے آدمیوں کو ان کے پیچھے چھلانگ لگانے کا حکم دیا، مگر جان کے خوف سے کسی نے جرأت نہ کی۔ لڑکے سرپٹ دوڑتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے اور آناً فاناً ہوا ہو گئے۔

وہ امجد کے بنگلے کے قریب پہنچے تو عمار نے چونک کر کہا۔ ''خیر مقدم کے لیے یہاں بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔''

ایک عجیب ساخت کی گاڑی بنگلے کے ڈرائیو پر کھڑی تھی۔ وہ اپنی کار وہیں روک کر اُتر پڑے۔ انہیں دیکھ کر مسٹر ولیم اور تین اور آدمی ان کی طرف بڑھے۔

''ان کے ارادے بھی کچھ نیک نظر نہیں آتے۔'' عمار نے سرگوشی میں کہا۔

''کیا بات ہے ولیم صاحب؟'' عامر نے پوچھا۔

''کہاں رہ گئے تھے آپ لوگ؟ ہم کافی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔'' مسٹر ولیم نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

''خیریت تو ہے؟'' عمار نے پوچھا۔

''میرے گھر چلو۔ وہیں چل کر بات ہو گی۔ تم میری کار میں بیٹھ جاؤ۔ یہ لوگ تمہارے بھائی کے ساتھ آ جائیں گے۔'' مسٹر ولیم نے عمار سے کہا۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ لڑکوں کو یہ نیا مخمصہ ناگوار معلوم ہوا مگر وہ خاموش رہے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی مسٹر ولیم کے گھر کے آگے جا رکیں۔ دونوں بھائی مسٹر ولیم کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں مسز ولیم ایک بڑی سی چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بولیں۔ ''بیٹھو! پولیس کے آنے تک تمہیں یہیں رہنا ہے۔''

''جی؟ پولیس کے آنے تک؟ یعنی ہم لوگ پولیس کو مطلوب ہیں۔ لیکن کیوں؟ کس جرم میں؟'' عامر نے حیرت سے پوچھا۔

''زومی کی مدد کرنے کے جرم میں۔''

''یہ بات آپ سے کس نے کہی؟'' عامر نے پوچھا۔

''خود پولیس نے ہمیں فون کیا اور ہدایت کی کہ تم لوگ جوں ہی سید صاحب کے بنگلے پر پہنچو، تمہیں روک لیں اور اپنے ہاں بٹھائے رکھیں۔''

''یہ قصہ کیا ہے؟'' عمار نے بھائی سے پوچھا۔

''کوئی چالاکی ہے۔ کوئی نئی چال۔'' عامر نے آہستہ سے کہا، پھر کچھ سوچ کر مسز ولیم سے پوچھا۔ ''کیا فون پر بات کرنے والے کی آواز غن غنی تھی، جیسے کوئی ناک پکڑ کر بول رہا ہو؟''

''ہاں، بالکل ایسی ہی آواز تھی۔ اب تم لوگ چپکے بیٹھے رہو ہمیں بھی اپنا کچھ کام دیکھنا ہے۔'' مسز ولیم کچن میں جاتے ہوئے بولیں۔ ''بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ دروازے پر میرے آدمی چوکس کھڑے ہیں۔'' یہ کہہ کر مسٹر ولیم بھی اُٹھے اور دروازے کے سامنے

برآمدے میں جا بیٹھے۔
''عجیب مصیبت ہے! یہ ضرور ان ہوٹل والوں کی شرارت ہے۔ اب وہ پولیس کے بھیس میں آئیں گے اور یہ بے وقوف ہمیں ان کے حوالے کر دیں گے۔'' عامر نے کہا۔
''مگر ہمیں یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔'' عمار بولا۔
عامر نے اپنے جاسوسی کٹ میں سے ایک پٹاخا نکالا اور کھڑکی میں سے گھر کے باغیچے میں پھینک دیا، جس سے زبردست دھماکا ہوا اور پھر خشک جھاڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ مسٹر ولیم نے چلا کر اپنے آدمی سے کہا کہ آگ بجھانے کی کوشش کرو۔ سب آدمی آگ بجھانے میں لگ گئے۔ اس بھگدڑ میں دونوں بھائی اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکل آئے اور امجد کے بنگلے پر پہنچ کر دم لیا۔
''اب دیکھتے ہیں ہماری غیر حاضری میں یہاں زومی نے کیا کارنامے انجام دیے ہیں۔'' عمار نے کہا۔ دونوں بنگلے کے اندر گئے اور سب سے پہلے عامر نے پولیس چوکی کو فون کیا۔ انسپکٹر نے کہا کہ ہم نے اس قسم کا کوئی فون مسٹر ولیم کو نہیں کیا تھا۔ عامر نے لارڈز ہوٹل کا واقعہ انسپکٹر کو سنایا اور بتایا کہ وہ ہوٹل جرائم پیشہ گروہ کا اڈا ہے اور وہاں چوری کے مال کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔
فون سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک بار پھر سارے گھر کا جائزہ لیا اور یہ تسلی کر کے کہ کسی کمرے میں زومی کی موجودگی کا کوئی سراغ موجود نہیں، وہ نیچے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے سونے کے لیے اوپر کی منزل میں جانے ہی والے تھے کہ عمار نے تجویز پیش کی:
''کیا خیال ہے، نیچے تہہ خانے کا چکر نہ لگا لیا جائے؟'' دونوں تہہ خانے میں اُتر گئے اور موم بتیاں جلا کر ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر اسی خفیہ راستے سے تہہ خانے کے دوسرے حصے میں آئے تو دیکھا کہ تابوت کا ڈھکنا ایک طرف کو سرکا ہوا ہے۔ عامر نے آگے بڑھ کر شمع کی روشنی تابوت کے اندر ڈالی تو اسے کاغذ کا ایک پرزہ نظر آیا۔ اس نے اُٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا:
''زیدی بھائیو! زومی تمہارے تعاقب میں ہے۔ سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ!''
''زومی تہہ خانے میں آیا ہے۔'' عامر نے رقعے کو جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔
اس کے بعد دونوں بھائی اوپر کی منزل میں آئے اور الماری میں سے کچھ چادریں ڈھونڈھ کر نکالیں۔ عامر ایک صوفے پر سو گیا اور عمار پہرا دینے لگا۔ وہ گاہے گاہے کمرے میں چکر لگا کر کھڑکی سے نیچے جھانک لیتا تھا۔ اتنے میں بجلی چمکی اور بادل گرجنے کی آواز کے ساتھ ہی بوندیں پڑنے لگیں۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ عمار کھڑکیاں بند کر رہا تھا کہ یکایک بجلی چمکی تو اس نے نیچے پورچ میں کوئی سایہ حرکت کرتے دیکھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ دوبارہ بجلی چمکی تو اس نے زومی کو صاف پہچان لیا۔ وہ ہیٹن یونی فارم پہنے ہوئے تھا۔ خوف سے عمار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے عامر کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔
دونوں کھڑکی میں آئے تو انہیں ایک سایہ جنگل کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا مگر تاریکی اس قدر گہری تھی کہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔ تعاقب کرنا مشکل بھی تھا اور بیکار بھی۔ انہوں نے اوپر کی کھڑکیاں بھی بند کر دیں اور دونوں سو گئے۔
صبح اُٹھتے ہی وہ اس جگہ پہنچے جہاں سایہ نظر آیا تھا۔ وہاں کیچڑ میں کسی آدمی کے پیروں کے نشان تھے۔
''زومی کے قدموں کے نشان!'' عمار نے چونک کر کہا۔ (باقی آئندہ)

فنِ تقریر: قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کا مطالعہ آپ کی خطابت کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ آپ کے سامعین چوں کہ قرآن پاک کی فضیلت اور حقانیت سے آگاہ ہیں اور یہ عقیدہ ان کے ایمان کا جزو ہے، اس لیے جب آپ اپنی تقریر میں اپنے موقف کی حمایت کے لیے قرآن پاک یا اسوۂ حسنہ سے مثال پیش کریں گے تو آپ کے سامعین پر اس کا بہت گہرا اثر ہوگا کیوں کہ ہر بنیادی دلیل اور مثال کو ٹھکرایا جا سکتا ہے لیکن قرآن پاک سے دی جانے والی دلیل کو کون ٹھکرا سکتا ہے۔
ایک اچھا اور کامیاب مقرر بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ دوسرے مذاہب کی مقدس کتب کا بھی مطالعہ کریں۔ علم و حکمت جہاں سے ملے، اسے حاصل کرنا چاہیے۔ پھر دوسرے انسانوں کے عقائد کا احترام بھی انسانیت کا بہت بڑا وصف اور احترام انسانیت کی ذیل میں آتا ہے۔ دوسرے مذاہب کی مقدس کتب کا مطالعہ آپ کے علم کو مکمل کرے گا، آپ کے لیے خطابت میں مددگار اور مفید ثابت ہوگا۔
امریکا کے آنجہانی صدر جان۔ ایف۔ کینیڈی نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں کہا تھا: ''یہ مت پوچھیے کہ آپ کے لیے آپ کا ملک کیا کر سکتا ہے۔ جاننے اور پوچھنے والی بات یہ ہے کہ آپ اپنے ملک کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' فن خطابت میں اس انداز کو اپنایئے۔ ایسے جملوں سے اپنی تقریر کو سجایئے۔ ایسے ہی مثبت سوالوں سے سامعین کے دلوں کو جھنجھوڑیے۔ یہ وہ گُر ہے جو خطابت میں جان ڈال دیتا ہے۔
اپنے جملے، ایسے بیانات اپنی ڈائری یا نوٹ بک میں نقل کر لیں۔ پھر ان کو موقع اور مناسبت کے اعتبار سے تقریر میں استعمال کریں۔

ننھے قارئین

1- جب بھی وہ میدان میں آئے
قدم قدم پہ ٹھوکر کھائے
اچھلے کودے دوڑے بھاگے
سب ہیں پیچھے وہ ہے آگے

2- کوئی نہ دیکھے اور دکھلائے
لیکن وہ سب کو تڑپائے

3- کرنے آئے من کی بات
جو بھی دیکھے مارے ہاتھ

4- کبھی لال کبھی ہیں کالے
ہزاروں بار ہیں دیکھے بھالے

5- نیلی چادر پیلے پھول
ان پر مٹی نہ ہے دھول

6- بڑی جائے بار بار
چھوٹی جائے ایک بار

7- چھوٹی قسمت پھوٹے بھاگ
گرمی میں بھی تاپے آگ

8- ہم نے دیکھے چار یار
آئے منڈی سے بازار
ایک کے سر پر ٹوپی
ایک کے سر پر بال
ایک کے پیٹ میں پتھر
ایک کے پیٹ میں دال

9- ایک پڑی چنگارا کہلاوے
تن من جلاوے راکھ بناوے
سب نے اس کو پسند کیا ہے
دیا سلائی میں بند کیا

جوابات: 1- فٹ بال 2- درد 3- مچھر 4- کوے 5- ستارے 6- گھڑی کی سوئیاں 7- چولہا 8- انار، ناریل، آم، امرود 9- دیا سلائی کی تیلی

کتے کو کتنی بھوک لگی ہوئی ہے، یہ اس کی شکل سے ہی ظاہر ہے۔ اب کم سے کم وقت میں ہڈی تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟
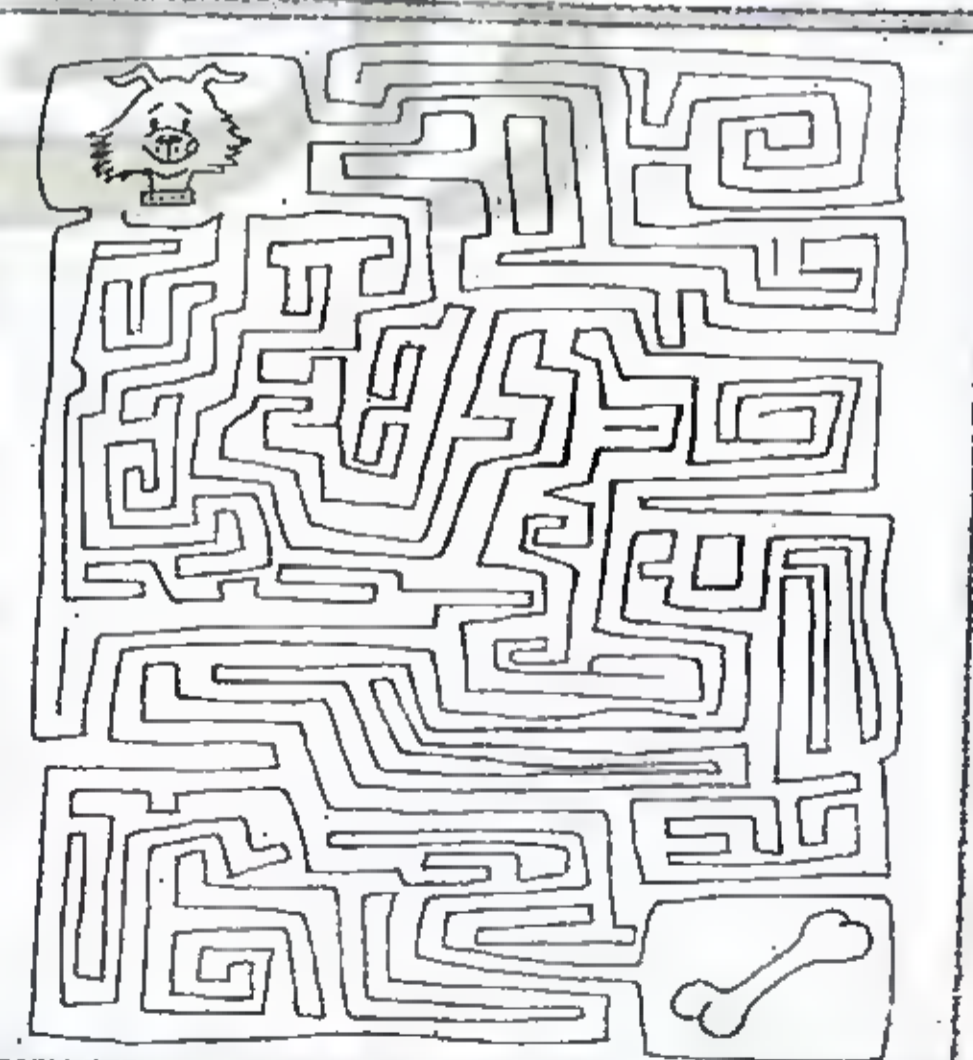
وسیم بڑی دیر سے نہر کے کنارے بیٹھا مچھلیاں پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہے مگر چالاک مچھلیاں ہیں کہ قریب نہیں پھٹک رہیں۔ بوجھیے تو بھلا کس چیز سے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔

عائشہ کو کراچی میں سمندر کی سیر کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے چچا جان کراچی میں رہتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اتفاق سے چچا جان کو لاہور اپنے کسی کام کے سلسلے میں آنا تھا۔ عائشہ بہت خوش تھی۔ عائشہ اور عالیہ نے خوشی خوشی سامان کی پیکنگ کی اور چچا جان کے ساتھ کراچی روانہ ہوگئیں۔

کراچی پہنچ کر سب نے پہلے دن خوب آرام کیا اور اگلے دن چچا جان سب بچوں کو لے کر ساحل سمندر کی سیر کے لیے روانہ ہوئے۔ ساحل سمندر پر فضا بہت خوش گوار تھی۔ ناریل اور پپیتے کے پیڑوں کی بھرمار تھی۔ ساحل پر چچا جان اور سب لوگ ناریل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ سفید چادر پر سب کھانے پینے کی اشیاء رکھ دی گئیں۔ عائشہ یہاں آکر بہت خوش تھی۔ چچا جان نے عائشہ سے اچانک ایک سوال کر ڈالا اور بولے:

''عائشہ بیٹی! بھوک لگے تو کھا لینا، پیاس لگے تو پی لینا، ٹھنڈ لگے تو جلا لینا۔''

پیارے بچو! ایسی کون سی چیز ہے جو ہم کھا بھی سکتے ہیں، پی بھی سکتے ہیں اور آگ جلا کر گرمی بھی لے سکتے ہیں۔ عائشہ نے اپنے اردگرد نظر دوڑا کر جواب بوجھ لیا ہے۔ آپ بھی ذرا غور کریں اور کھوج لگا کر انعام جیتیے!
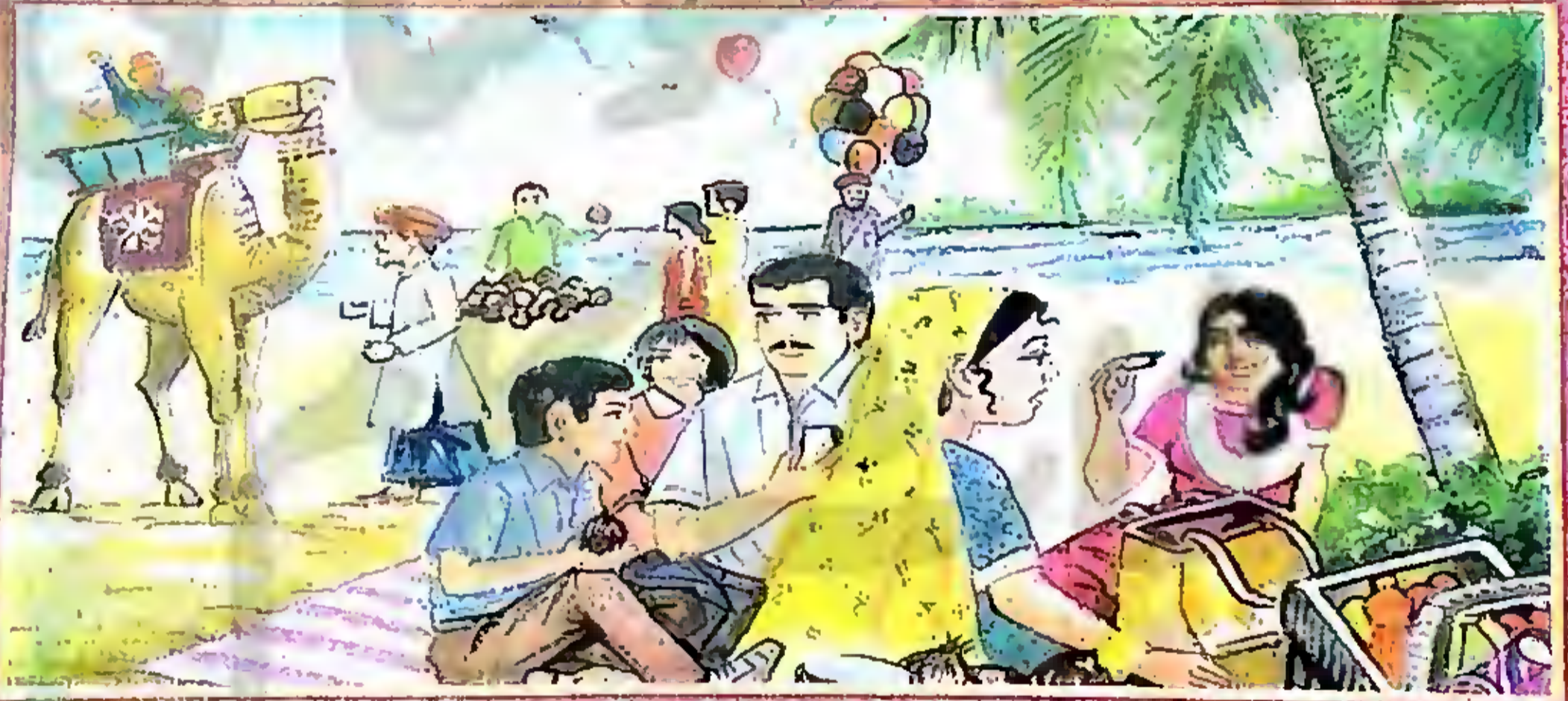
اگست میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے:

علی نے اخبار کے ٹکڑے کو نیچے سے باہر کی طرف سرکایا اور تار کی مدد سے دروازے کے تالے سے چابی کو باہر گرایا۔ چابی اخبار پر گری اور علی نے اخبار کو اندر کھینچ لیا۔ اس طرح علی نے دروازہ کھول کر آزادی حاصل کی۔

اگست 2015ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- محمد حسنین حنیف، لاہور
2- ابدال شفقت، اکوڑہ خٹک
3- سید شہریار علی، لاہور
4- اریبہ ثمرین، لاہور
5- محمد حمزہ نعیم، میانوالی

مدیرِ تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں ہما ثانیہ ارشد ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، اُمید ہے کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح بڑا ہی اچھا تھا۔ بالخصوص کھٹر کھاند گروپ، کنوئیں کا قیدی، پیارے اللہ کے پیارے نام بہت ہی اچھے تھے۔ میں نے پچھلے ماہ بھی خط لکھا تھا لیکن آپ نے شائع نہیں کیا۔ اُمید ہے کہ اب آپ ضرور شامل کریں گے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (ہما ثانیہ ارشد، گوجرانوالہ)

پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ ذرا اپنی ردی کی ٹوکری سے دُور رکھیے گا۔ میں لطیفے اور دماغ لڑاؤ کے جوابات بھیج رہی ہوں۔ اس دفعہ ہاتھی کا بچہ، کنوئیں کا قیدی اور دینو حلوائی بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ زندہ لاش بھی بہت زبردست سلسلہ ہے۔ نظم آزادی بھی بہت اچھی تھی۔ مضمون آزادی کا دن پڑھ کر پاکستان کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ آئیے مسکرائیے پڑھ کر ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ آپ کا رسالہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس مہینے میں نے اسے پہلی دفعہ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین)

(خدیجہ شجاعت، لاہور)

السلام علیکم! میں پچھلے دس سال سے والدین سے چوری چوری تعلیم و تربیت پڑھتا رہا ہوں۔ گزشتہ ماہ میری والدہ نے کہا کہ دکھاؤ مجھے کیا ہے اس میں۔ انہوں نے ڈانٹا بھی اور پڑھ بھی لیا اور پھر سارا پڑھ کے چھوڑا۔ اب ہر ماہ پوچھتی ہیں تعلیم و تربیت کیوں نہیں آیا، جلدی سے لاؤ۔ (حبیب الرحمٰن، ننکانہ صاحب)

☆ والدہ صاحبہ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ رسالے کا خریدار بننے کے لیے سرکولیشن منیجر سے رابطہ کریں۔

میں نے پہلے بھی خط بھیجا لیکن آپ نے شائع نہیں کیا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ میں اپنی دو تحریریں بھیج رہی ہوں، مہربانی فرما کر انہیں شائع کیجیے۔ اللہ آپ کو لمبی عمر، صحت اور شہرت دے۔ آپ کا ادارہ دُنیا کا نمبرون ادارہ ہے۔ اللہ اسے دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے اور یہ ادارہ آسمانِ علم پر ستارہ بن کر چمکے۔ میری تصویر، میری زندگی کے مقاصد میں شائع کرنے کا شکریہ۔ (ثمن رؤف، لاہور)

کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے خیریت سے ہوں گی۔ جولائی کے شمارے میں کھوج لگائیے میں جیتنے والوں میں اپنا نام دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ میں آٹھویں جماعت کے امتحان میں اپنے اسکول میں اوّل آئی ہوں۔ مبارک باد تو دیں۔ ویسے میں نے خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کی ہے۔ اُمید ہے ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا۔ باقی شمارہ تو سُپرہٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو مزید ترقی دے۔ آمین!

(فارین شہزاد، پشاور)

☆ آپ کو بہت بہت مبارک ہو اور بہت سی دُعائیں۔

میں دو سال سے باقاعدہ تعلیم و تربیت کی قاری ہوں لیکن خط لکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا ہے۔ تعلیم و تربیت ایک مکمل رسالہ ہے۔ ہم پانچوں بہن بھائی اور ماما، بابا بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اپنی باری کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ درسِ قرآن و حدیث اور پیارے اللہ کے پیارے نام بہترین سلسلے ہیں۔ کیا خوب لکھتے ہیں نواب صاحب، ہر بات خود بخود دل میں اُتر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بلاعنوان ایسا سلسلہ ہے جس کو رسالہ کھولتے ہی سب سے پہلے اونچی آواز میں پڑھ کر سب کو سنایا جاتا ہے اور اس سے خوب لطف اُٹھایا جاتا ہے۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا ڈاکٹر طارق ریاض کی ایک اچھی کاوش ہے۔ کھٹر کھاند گروپ تو اتنا ہنساتا ہے کہ بس...... اور ہاں میرا موسٹ فیورٹ سلطانہ جی کا ناول "زوبی" اچھا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے جاسوسی کہانیاں بہت پسند ہیں اور اس ناول کا تو جواب ہی نہیں۔ ہمارے دونوں سراغ رساں عامر اور عمار مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ آخر میں یہی عرض ہے کہ اس ماہ میرا نہم کا رزلٹ آنا ہے۔ میں سائنس گروپ کی طالبہ ہوں۔ سب میری کامیابی کے لیے دعا کریں۔ آپ کی اور تعلیم و تربیت کی خیر خواہ۔ (حفصہ یاسر گوندل، گوجرانوالہ)

☆ آپ کا خط بہت دل چسپ ہے، تبصرے اور پسندیدگی کا شکریہ۔

میری طرف سے آپ کو اور آپ کی ٹیم کو 14 اگست مبارک ہو۔ اگست کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ تمام کہانیاں مزے دار تھیں۔ دینو حلوائی، پیارے اللہ کے پیارے نام، کھٹر کھاند گروپ نے عید منائی، بنٹی کا فرار، کنوئیں کا قیدی، آپ بھی لکھیے اور ہاتھی کا بچہ ٹاپ

پرتھیں۔ کھیل ون منٹ کا، اوجھل خاکے اور کھوج لگائیے بھرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ انھیں جاری رکھیے گا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ امید ہے ضرور شائع کریں گے۔ (ایمن امین، گوجرانوالہ)

امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ اس دفعہ کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ خاص طور پر جادوئی کہانی، کھڑ کھاند گروپ نے عید منائی بہت مزے دار تھیں۔ میں کچھ لطائف بھیج رہی ہوں، پلیز! انہیں شائع کیجیے گا۔ میں نے پہلے بھی لطائف اور دو کہانیاں بھیجی تھیں جو شائع نہیں ہوئیں اور پلیز، میرے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر مت کیجیے گا۔ اس مہینے میرے بھائی اور بہن کی سالگرہ ہے۔ (بازیہ ندیم، راول پنڈی)

☆ آپ کو سال گرہ مبارک ہو۔

امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ آخر ہم جو دن رات آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ ہم مسلسل دو سال سے تعلیم و تربیت کے قاری ہیں مگر خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کی ہے۔ مہربانی کر کے ضرور شائع کریں۔ اگست کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ دینو حلوائی، پیارے اللہ کے پیارے نام، پاکستان کا لازوال سفر، کھڑ کھاند گروپ نے عید منائی، مادام کیوری اور زندہ لاش کا تو دل بہت اچھی تھا۔ ہم کچھ منتخب اشعار بھیج رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ شائع کریں گے۔ ہمارے خط کو ردی کی ٹوکری کی زینت نہ بنائیں۔ اللہ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ آمین! کہانیاں بھیجنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہماری رہنمائی فرمائیں۔
(عثمان ربیعہ طارق، شراکت، قصور)

آپ کو اور سارے پاکستانیوں کو یوم آزادی مبارک ہو۔ اگست کا تعلیم و تربیت بہت اچھا تھا۔ کھڑ کھاند گروپ، مادام کیوری، دینو حلوائی، بنٹی کا فراد سپرہٹ تھیں۔ میں ایک کہانی بھیج رہی ہوں اگر اچھی ہو تو ضرور شائع کیجیے گا۔ مجھے بتا دیں کہ کیا ہم 'آپ بھی لکھیے' میں زیادہ کہانیاں بھیج سکتے ہیں۔ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور تعلیم و تربیت کو بہت زیادہ ترقی عطا فرمائے۔ آمین! ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ پاکستان زندہ باد! (ملیحہ شہباز، راول پنڈی)

☆ جی ہاں! ایک سے زیادہ کہانیاں بھیج سکتے ہیں۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت ہم بہن بھائی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ دسمبر 2014ء سے رسالہ ہمارے کسی بھی قریبی بک اسٹال پر دستیاب نہیں، حالاں کہ پہلے آسانی مل جاتا تھا۔ امید ہے آپ غور فرمائیں گے اور ہم ماہنامہ تعلیم و تربیت پڑھ سکیں گے۔ (مریم ساجد، حمزہ ساجد، کوئٹہ)

اگست کے شمارے کا سرورق دیکھ کر ماضی کی پہلے ہونے والی جنگ یاد آ گئی۔ پڑھا تو پاکستان کی تاریخ پر عمدہ مضمون معلومات سے بھرپور پایا۔ ہونہار مصور میں اپنی تصویر دوسرے نمبر پر دیکھی تو خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ الغرض پورا شمارہ اعلیٰ تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہونہار مصور میں آسان موضوع دیا کریں اور کوئی نیا سلسلہ شروع کریں۔ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو! (کاشف طاہر، لاہور)

اگست کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ تمام کہانیاں عروج پر تھیں۔ تعلیم و تربیت میرے گھر میں تمام افراد بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں دہم جماعت میں پڑھتی ہوں اور میرا نہم جماعت کا نتیجہ آنے والا ہے۔ پلیز، آپ بھی دعا کیجیے گا۔ (اقراء شہزاد، راول پنڈی)

میں کافی عرصے سے تعلیم و تربیت کا خاموش قاری ہوں۔ اس بار خط اس امید کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ ضرور شائع ہوگا۔ اگست کا شمارہ بہترین تھا۔ کنویں کا قیدی کہانی بہت اچھی لگی۔ خوف ناک کہانیاں بھی شائع کریں۔ (محمد علی، لاہور)

اس ماہ کا رسالہ بہت زبردست تھا۔ سب کہانیاں سبق آموز تھیں۔ میں ایک کہانی بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ قابل اشاعت ہوگی۔ انکل پلیز! آپ کوپن کے لیے علیحدہ صفحہ دیا کریں۔ جب کہانی والے صفحے کو کاٹتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں نے پچھلے ماہ بھی خط بھیجا تھا جو ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا تھا۔ پلیز! اس دفعہ ہمارا دل رکھ لیں، آپ کی مہربانی ہوگی۔ میں نے محنت کی عظمت کہانی بھی بھیجی تھی۔ کیا وہ قابل اشاعت ہے؟ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ میرا رزلٹ آنے والا ہے، پلیز! میرے لیے دعا کیجیے گا۔ (محمد یٰسین ظہور، قادر آباد)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

رمشاء اکبر قادری، سید محمد عمر نفیس، گوجرانوالہ۔ محمد طیب مقصود، حسن رضا مختار، فیصل آباد۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ حافظ سیف الرحمٰن، خوشاب، شمائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ شیردنیہ ثناء، حیدر آباد۔ خدیجہ گل سید، چارسدہ۔ ازکیٰ اخلاق بٹ، شیخوپورہ۔ محمد عرفان اقبال، لودھراں۔ جویریہ یونس، مومنہ عامر، محمد حسن محمود، سیدہ مہرین فاطمہ، ماہم عمران، وجیہہ فضل، اویس الرحمٰن، اسامہ فضل، صوفیہ سلطان، شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ ازکیٰ آصف، مناہل فیض، محمد جنید فیض، پشاور۔ محمد حسان نصیر، چارسدہ۔ اسد اللہ ناصر، بہاول پور۔ عائشہ خالد اعوان، حویلیاں۔ مہر غلام ذاکر حسن، جھنگ صدر۔ محمد سلمان، ایبٹ آباد۔

افلاطون نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا۔ ”جب تمہیں پتا چلے کہ تمہاری بستی میں کوئی شاعر آ رہا ہے تو بستی کے باہر جا کر اس کا استقبال کرنا۔ اس کی راہ میں پتیاں بچھانا، اس پر پھول نچھاور کرنا، اسے سر آنکھوں پر بٹھانا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا کلام سنانے لگے، اس سے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا کہ مہربانی فرما کر آپ کسی اور بستی میں تشریف لے جائیں۔“

لیکن کھڑکھاند گروپ کو یہ بات کون سمجھائے؟ گنجے والا کے سر پر جب چیکلی سوار ہو جائے تو اسے سمجھانا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے، جتنا کشمیریوں کو بھارت سے حقِ خود ارادیت دلوانا اقوامِ متحدہ کے بس سے باہر ہے۔

گنجے والا کا خیال تھا کہ اس بار ایک زبردست قسم کے مشاعرے کا بندوبست کیا جائے۔ (کیوں کہ گنجے والا پر آج کل شاعری کا جنون سوار تھا) ہر چند کہ تمام کھڑکھاندیوں نے اسے اس خطرناک اقدام سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی اور ”کھڑکھاند میوزیکل گروپ“ کے عبرت ناک انجام کا حوالہ بھی دیا۔ (جو یقیناً قارئین کو یاد ہوگا) لیکن زبردست کا ٹھینگا سر پر! مجال ہے جو اس کے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔ (ویسے آپس کی بات ہے، ان کے سر پر بال ہوتے تو جوں بھی رینگتی!)

چنانچہ افراتفری میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن پھر بھی انتظامات قابلِ رشک تھے۔ آبادی سے باہر ایک وسیع میدان میں قناتیں لگائی گئی تھیں۔ شامیانے لگانے کی ضرورت اس لیے پیش نہیں آئی تھی کہ حالیہ بارشوں کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ قناتوں پر برقی بلب چمک رہے تھے۔ میدان کی ایک سائیڈ پر اسٹیج بنایا گیا تھا جو رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگرچہ پبلسٹی کے لیے وقت کم تھا لیکن پھر بھی اردگرد کے دیہات سے بڑی تعداد میں عوام جوق در جوق شرکت کے لیے آئی تھی اور اس وقت پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دراصل دوستوں سے زیادہ اس مشاعرے کی پبلسٹی گنجے والا کے مخالفوں نے کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ عوام زیادہ ہو گی تو انتظام کم پڑ جائے گا۔ اس طرح کھڑکھاند گروپ کی بے عزتی ہو گی لیکن ان کے اس اقدام سے الٹا مشاعرے کی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک دیہاتی تو اپنے سر پر مرغیوں کا ایک ٹوکرا بھی رکھ لایا تھا جس میں درجن بھر قریب المرگ مرغیاں تھیں۔ گنجے والا کے مخالفین نے یہ افواہ بھی اڑا دی تھی کہ مشاعرے میں حکیم جانو جیلوی بھی آ رہے ہیں جو آخر میں ”رانی کھیت“ کے ٹیکے مفت تقسیم کریں گے۔ چنانچہ وہ بے چارہ اسی آس میں مرغیاں اٹھا لایا تھا۔ ویسے بھی مرغیاں

رات بھر کی مہمان لگتی تھیں۔ ایک اور دیہاتی حکیم جانو حیلوی کا نام سن کر ایک کالے رنگ کا ہٹا کٹا گدھا لے آیا تھا۔ وہ بھی مفت دوا لینے کے چکر میں تھا۔ ویسے شکل سے تو گدھا اس دیہاتی سے زیادہ صحت مند لگتا تھا۔

افراتفری میں بھی بیس کے قریب شاعروں کا بندوبست ہو گیا تھا۔ شاعروں کی پرتکلف کھانوں سے تواضع کی گئی۔ اس وقت تمام شعراء اپنے اپنے دیوان سمیت اسٹیج پر رونق افروز ہو چکے تھے۔ گنجے والا اور مبارکاں بھی اسٹیج پر اکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے جب کہ چھوٹے والا اور بلنگی کے ذمے انتظامات تھے۔ لہٰذا وہ عوام کی صفوں میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ دادا بڈی کے ذمے نقابت تھی۔ ہر چند کہ گنجے والا نے اسے اس کٹھن کام سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ دادا بڈی ہی کیا جو اپنی ضد چھوڑ دے۔ بالآخر گنجے والا کو ہی ہار ماننی پڑی تھی۔ دادا بڈی نے مائیک سنبھالا اور کہا: ''میرے معزز مہمانو! یتیم شاعرو.... اوہ سوری ..... عظیم شاعرو اور نوجوانو! آج کا مشاعرہ پائی خیل کی تاریخ کا پہلا عظیم الشان مشاعرہ ہے۔ یہ ایک فری مشاعرہ ہے، جس میں طرح مصرع یا زمین آسمان کی کوئی پابندی نہیں۔ ہر شاعر اپنی مرضی کی بکواس.... ارے باپ رے.... اپنی پسند کا کلام سنا سکتا ہے۔'' دادا بڈی کی زبان پھسلی تو تمام شاعروں نے انہیں کینہ توز نظروں سے دیکھا لیکن دادا بڈی نے فوراً ہی بات کو سنبھال لیا۔ کھڑ کھاند گروپ کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔ دادا بڈی نے کہا۔ ''اب انتظار کی گھڑیاں ختم.... اب مشاعرے کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے میں دعوت دوں گا.... جناب گنجے والا کو.... کہ وہ اسٹیج پر ''قدم پنجہ'' فرمائیں اور اپنا کلام سنائیں!''

''ارے بے وقوف.... قدم رنجہ ہوتا ہے!'' گنجے والا نے جھلا کر کہا۔

''ہوتا ہے.... چلتا ہے.... ڈیتا ہے!'' دادا بڈی نے لاپروائی سے کہا۔

گنجے والا ڈائس پر آئے، کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر لہک لہک کر ترنم سے گانے لگے....

لگتا ہے خوب ہی میرا اتوار بازار میں
جیبیں تراش لیتا ہوں اس بھیڑ بھاڑ میں
رہنے کو جو جگہ نہ ملی ان کو کہیں اور
جوتوں نے گھر بنا لیا میرے مزار میں
ڈر ڈر کے کھا رہا ہوں میں کھانا تو اس لیے
بیگم نے کچھ ملا نہ دیا ہو اچار میں
کل تک تو مل ہی جائے گا راشن میں دال گھی
اس آس پہ لگا ہوں ابھی سے قطار میں

''مبارکاں مبارکاں!'' مبارکاں نے لہک کر کہا۔ ''آپ پر آ گئی مرغی!''

''ضرور ضرور.... لیکن اگلے جنم میں!'' گنجے والا نے چہک کر کہا اور مبارکاں نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا۔ ''خدا کسی کو غریب بھی نہ کرے!''

دادا بڈی نے پھر مائیک سنبھالا۔ ''اب میں دعوت دینے لگا ہوں عجیب جلالی کو.... کہ وہ اسٹیج پر ''رونق انگیز'' ہوں اور آپ کو اپنا کلام سنائیں۔''

''احمق کہیں کے.... رونق افروز ہوتا ہے، رونق انگیز نہیں۔'' گنجے والا نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

''آپ کی یہ شرانگیزی مجھے لڑائی پہ اکسا رہی ہے۔'' دادا بڈی نے غصے سے کہا اور گنجے والا پہلو بدل کر رہ گئے۔

عجیب جلالی شاید عوام میں جا چھپے تھے، کیوں کہ وہ ادھر سے ہی اسٹیج کی طرف دوڑے۔ راستے میں کسی سے ٹکرا کر گرے اور پھر دوڑ پڑے۔ گنجے والا اس وقت ڈائس چھوڑ کر واپس اپنی کرسی کی طرف آ رہے تھے۔ عجیب جلالی ان سے ٹکرا گئے اور دونوں دھڑام سے اسٹیج پر گر پڑے۔ پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ گنجے والا نے چنگیزی نظروں سے اسے گھور کر دیکھا۔ عجیب جلالی جلدی سے اٹھے اور آؤ دیکھا، نہ تاؤ.... تان شاپ شروع ہو گئے۔

یارو یہ کس خرابے میں پھر آ گیا ہوں میں
پچھلے جنم کی لوگو سزا پا گیا ہوں میں

''واہ.... وا!'' کی آوازیں ابھریں۔

سارے خیال میرے کہاں کہاں بکھر گئے
یہ کن گدھے سے آتے ہی ٹکرا گیا ہوں میں

گنجے کا ذہن جس کر برا حال ہو گیا۔

گنجے والا نے گرج کر کہا۔ ''گدھے ہو گے تم .... اور تمہارا پورا

خاندان!''

عجیب جلالی نے عاجزی سے کہا۔ ''جناب، میں آپ کی بات نہیں کر رہا... میں چار ٹانگوں والے گدھے کی بات کر رہا ہوں۔''

''اہم.... تو آپ اسٹیج پر آتے وقت اسی لیے گر پڑے تھے۔'' گنجے والا بڑبڑایا۔

عجیب جلالی نے اگلا شعر پڑھا....

تیرے غم کے چند پیس، یہ زردے کے چند تھال
کسٹرڈ کے چند ڈونگے بھی کھا گیا ہوں میں

یہ سن کر دادا بڈی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے مبارکاں سے کہا۔ ''یہ کس بلا کو پکڑ کر لے آئے ہو؟ تین آدمیوں کا کھانا تو یہ اکیلا ہڑپ کر گیا ہے۔''

آدھی پلیٹ تو میرے اس پیٹ میں گئی
اور دو پلیٹ حلوے کی چرا گیا ہوں میں

''پکڑو پکڑو.... جانے نہ پائے.... ارے تلاشی لو اس کی.... یہ حلوہ چرا کر لے جا رہا ہے۔'' گنجے والا چلایا۔

چھوٹے والا اور ملنگی اسٹیج کی طرف دوڑے۔ عجیب جلالی نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو حسرت سے کہا۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے حلوے کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب سے پکڑا گیا ہوں میں

اتنے میں ملنگی اور چھوٹے والا نے اسے قابو کر لیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن ملنگی نے اس کی اندرونی جیب سے کلو بھر حلوہ برآمد کر ہی لیا اور پھر وہ اسے ڈنڈہ ڈولی کر کے پنڈال سے باہر پھینک آئے تھے۔ پنڈال میں عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

دادا بڈی ڈائس پر آ کر عوام کو ابھی چپ ہی کرا رہے تھے کہ اچانک عجیب جلالی کسی جن کی طرح دوبارہ اسٹیج پر نمودار ہو گیا۔ گنجے والا نے چلا کر کہا۔ ''اب پھر کیوں آ گئے ہو؟''

عجیب جلالی نے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

لوگوں نے قہقہوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ محفل زعفران زار بن گئی۔ گنجے والا نے اپنا گنجا سر پیٹ لیا۔

صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دادا بڈی نے جلدی سے اگلے شاعر کو دعوت دی۔ ''اب میں دعوت دوں گا.... نصیر پائی حلوی کو.... کہ وہ آئیں اور کھڑکھاند گروپ کی شان میں ''وظیفہ'' پڑھیں!''

''ہائے اللہ!'' گنجے والا نے جھلا کر کہا۔ ''اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ قصیدہ ہوتا ہے قصیدہ.... پتا نہیں کس گدھے نے اسے اسٹیج سیکرٹری بنا دیا۔''

دادا بڈی نے چہک کر کہا۔ ''جناب، آپ نے....!''

اور گنجے والا شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

نصیر پائی جیلوی نے اپنا دیوان کھولا اور شروع ہو گئے۔

شکل سے بھکشو نظر آتے ہیں سب
اِن ملنگوں میں ملنگی کون ہے؟
سارے کھڑکھاندی بھی حاضر ہیں یہاں
پوچھ لو اِن سے ''دو جنگی'' کون ہے؟

(دوجنگی: سرائیکی.... دو ٹانگوں والی.... کھڑکھاند گروپ مرغی کھانے کا بہت شوقین ہے اور گنجے والا اسے پیار سے دوجنگی کہتا ہے۔)

ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں سب
پوچھتے ہو کیا کہ بھنگی کون ہے؟

یہ شعر سن کر عوام بھڑک اٹھی اور گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش شروع ہو گئی۔ لوگ یہ بھی بھول گئے کہ یہ قصیدہ (اگر یہ واقعی قصیدہ تھا تو.... ورنہ اشعار سے تو'' ہجو'' ہی لگتا تھا) عوام کی شان میں نہیں، بلکہ کھڑکھاند گروپ کی شان میں پڑھا جا رہا ہے۔

نصیر پائی جیلوی نے گھبرا کر آخری شعر موزوں کیا.... اور کیا حسب حال شعر تھا!

ہر طرف سے کچرے کی برسات ہے
جانے دشمن کون، سنگی کون ہے؟

اتنے میں اچانک لائیٹ چلی گئی۔ یک دم گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اس سے پہلے کہ جنریٹر چلایا جاتا، اچانک عوام کے شور سے گھبرا کر گدھے نے رسّی تڑائی اور ''ڈھینچوں ڈھینچوں'' کے بے ہنگم سروں کے ساتھ پنڈال میں بھاگنا اور دولتیاں چلانا شروع کر دیں۔ چند ایک آوارہ کتے بھی اس بھاگ دوڑ میں شامل ہو گئے اور لوگوں کی پنڈلیوں پر اپنے ''دندانِ آز'' تیز کرنے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

کسی نے چلا کر کہا۔ ''ارے بچنا.... گدھا پاگل ہو گیا ہے۔''

پھر کیا تھا، دیہاتیوں نے اپنی لاٹھیاں اٹھالیں اور ہر کالی چیز کو گدھا سمجھ کر ایک دوسرے کی پٹائی کرنے لگے۔ کچھ فنکار قسم کے لوگوں نے موقع غنیمت جانا اور جوتے، پگڑیاں، برتن.... غرض جو چیز ہاتھ لگی، مالِ غنیمت سمجھ کر لے اڑے۔ دادا بڈی کی پگڑی بھی اس ہنگامے کی نذر ہو گئی۔ ایک دھان پان قسم کے شاعر نے تو خود اپنی جان مشکل سے بچائی، ورنہ لوگ تو اسے بھی اٹھالے جاتے۔ جو دیہاتی بے چارہ مرغیاں لایا تھا، لائٹ آئی تو ٹوکرے میں صرف درجن بھر پر ہی دیکھنے نصیب ہوئے۔ خود گنجے والا نے قسم کھا کر کہا تھا کہ کسی بدبخت نے میری مونچھیں اکھاڑنے کی ناپاک جسارت بھی کی تھی لیکن میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے تیز دانتوں سے اُدھیڑ ڈالا تھا۔

تمام شاعروں کے دیوان بھی کسی نے اُڑا لیے۔ یہ واحد چیز تھی جو دستیاب ہوئی، ورنہ باقی چیزیں تو ایسے غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور دیوان بھی اس حالت میں کہ اگلی صبح فتح گولڑوی ان میں کباب اور سموسے لپیٹ لپیٹ کر بیچ رہا تھا۔

جب شاعروں کو یہ صورتِ حال معلوم ہوئی اور انہوں نے اپنے کلام کی یہ ''بے حرمتی'' ہوتے دیکھی تو انہوں نے گنجے والا کو ایسی قاتلانہ دھمکیاں دی تھیں کہ گنجے والا کو فرار ہو کر علاقہ غیر میں پناہ لینا پڑی تھی!!!

☆☆☆

کویل کوئے کے گھونسلے میں انڈے کیوں دیتی ہے؟

اکثر پرندوں کی مادائیں اپنے انڈوں پر بیٹھ کر انہیں سیتی ہیں تاکہ بچے نکل آئیں۔ لیکن بعض مادائیں ایسی ہیں جو اپنے انڈے نہیں سیتیں۔ بلکہ وہ گھونسلا تک نہیں بناتیں اور دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں جا کر انڈے دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ بھاگ جاتی ہیں اور پھر واپس نہیں آتیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے پرندے یا سوتیلے ماں باپ ان کے انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان بچوں کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کرتے ہیں۔

کویل کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے انڈے کو کھا جاتا ہے۔ اس لیے وہ کوے کے گھونسلے میں جا کر انڈا دے دیتی ہے اور اگر گھونسلے میں کوے کا انڈا ہو تو نیچے پھینک دیتی ہے۔ کوی یہ سمجھتی ہے کہ یہ میرا ہی انڈا ہے۔ وہ اسے سیتی ہے اور اس میں سے بچہ نکلنے کے بعد اسے دانہ بھی بھراتی ہے۔ کویل کا یہ بچہ بڑا ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فاختہ بھی ایسا ہی کرتی ہے اور اس کے بچے بھی کوا ہی پالتا ہے۔

ایک قسم کا پرندہ، جسے گائے پرندہ (Cowbird) کہتے ہیں، امریکہ میں بہت مشہور ہے۔ یہ پرندہ بھی دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دیتا ہے۔ اس کو گائے پرندہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ گائے اور گھوڑے کے پاؤں کو دیکھتا رہتا ہے۔ جوں ہی وہ کیڑے مکوڑوں کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں، یہ پرندہ انہیں اٹھا لیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ گائے کی پشت پر بھی بیٹھ جاتا ہے اور ان کیڑے مکوڑوں کو پکڑتا جاتا ہے، جو گائے کو تنگ کرتے ہیں۔ ☆

آپ بھی لکھیے

اصل قربانی

(محمد یسین ظہور، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

عمار شام کو ٹیوشن سے گھر لوٹا تو اس نے اپنی امی سے پوچھا۔ ''امی ہم قربانی کے لیے بکرا کب لائیں گے۔'' تو اس کی امی بولی: ''بیٹا تمہارے ابو کہہ تو رہے تھے کہ ایک دو دن تک لے آویں گا۔'' عمار نے کہا: ''امی! میرے سبھی دوست بکرا لے آئے ہیں، صرف میں اور احمد رہتے ہیں۔'' امی بولی: ''بیٹا! میں تمہارے ابو سے کہوں گی کہ وہ ٹائم نکال کر منڈی سے بکرا خرید لائیں۔'' عمار نے کہا: ''امی! میں نے اور احمد نے مشورہ کیا ہے کہ اس دفعہ ہم قربانی کے لیے اکٹھے بکرا خریدیں گے۔'' امی بولی: ''ٹھیک ہے، بیٹا! اپنے ابو سے بات کر لینا۔'' شام کو جب عمار کے ابو گھر آئے تو اس نے بکرے کا موضوع چھیڑ دیا۔ عمار بولا: ''ابو میں نے اور احمد نے مشورہ کیا ہے کہ ہم اس دفعہ اکٹھے بکرا خریدیں گے۔ کل ان کے ابو آجائیں تو ہم چاروں اکٹھے بکرا لینے چلیں گے۔'' ابو بولے: ''ٹھیک ہے بیٹا۔'' عمار یہ بتانے اپنے دوست احمد کے گھر بھاگا گیا۔

دوسرے دن احمد اپنے ابو کا انتظار کر رہا تھا اور اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابو نے تو چار بجے آنے کا کہا تھا جب کہ اب سات بج رہے ہیں۔ احمد یہ سوچتے ہوئے گھر سے باہر نکلا اور عمار کے گھر کی طرف چل پڑا۔ عمار اسے دیکھ کر خوش ہو گیا اور احمد کو لے کر گھر چل پڑا۔ احمد کو وہاں گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ احمد بولا: ''عمار آؤ پارک میں چلتے ہیں۔'' عمار بولا: ''اس وقت پارک میں؟'' احمد نے کہا: ''ہاں! پتا نہیں، کیوں مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ جب وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پارک سے واپس لوٹے تو انہوں نے دیکھا کہ احمد کے گھر کے سامنے لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہے۔ وہ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ احمد کے ابو کی لاش ایمبولینس سے باہر نکالی جا رہی ہے۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ یہ دیکھ کر احمد بے ہوش ہو گیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ عمار جلدی سے اُٹھ کر احمد کے پاس آیا اور بولا: ''موت تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کا ذائقہ ہر ایک کو چکھنا ہے۔ ہمیں اس آزمائش کے موقع پر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اللہ کی رضا سمجھ کر صبر کرنا چاہیے۔'' عمار کی باتیں سن کر احمد کے دل کو کچھ سکون ہوا۔

تمام محلے والوں نے غم کے اس موقع پر احمد کے گھر والوں کا ساتھ دیا۔ اس سانحہ کے ایک ہفتہ بعد جب عمار کے ابو نے ایک شام عمار سے جانور لانے کے لیے کہا تو عمار کہنے لگا: ''ابو جان! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم قربانی کے لیے بکرا نہ خریدیں اور ان پیسوں کو کسی دوسرے طریقے سے قربان کر دیں۔ ابو جان نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''بیٹا! وہ کیسے؟''

عمار بولا: ''ابو جان! احمد کے ابو کی وفات کے بعد ان کی گزر اوقات مشکل سے ہو رہی ہے۔ اب ساری ذمہ داری اس کی امی پر ہے۔ کیوں نہ ہم یہ پیسے ان کو دے دیں تاکہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں اور اپنی ضروریات کی اشیاء خرید سکیں۔''

عمار کے ابو بولے: ''بیٹا! ہم ضرور ایسا ہی کریں گے۔'' پھر عمار کے ابو سوچنے لگے کہ ایک بکرے کی قربانی سے تو ہم تھوڑا تھوڑا گوشت سارے گھروں میں بھیجیں گے تو ان کے حصے میں صرف ایک وقت کا کھانا آئے گا۔

اگر ہم واقعی ان پیسوں کو احمد اور اس کے گھر والوں کی ضرورت پوری کر دیں تو یہ اس سے بھی اچھی قربانی ہو گی۔ پھر اگلے دن وہ بکرا خریدنے والی ساری رقم احمد کی امی کو تھما آئے۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

آفت میں صبر......

(بادیہ ایمن، جہلم)

''ہائے...... میں مر گیا۔ میری ٹانگ...... ہائے امی کہاں ہیں آپ......؟ ہائے۔'' عمر لنگڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور ٹانگ پکڑ کر زور زور سے چلانے لگا۔

''کیا ہوا......؟ چلا کیوں رہے ہو تم......؟'' آپی گھبرائی ہوئی صحن میں آئیں۔ ''آپی...... میری ٹانگ۔'' آپی جھک کر اس کا زخم دیکھنے لگیں، پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولیں: ''تو یہ ہے عمر! معمولی سی خراشیں ہیں اور تم ایسے چلا رہے ہو جیسے ٹانگ ہی ٹوٹ گئی

ہو۔''

''ہائے...... بہت درد ہو رہا ہے...... امی کو بلائیں۔'' عمر نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''امی بازار گئی ہیں، میں مرہم لگا دیتی ہوں۔ صبر کرو ذرا۔'' آپی اندر چلی گئیں۔ ''مجھ سے نہیں ہوتا صبر وبر، جلدی کریں۔'' عمر نے پیچھے سے چیختے ہوئے کہا۔

یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔ جب بھی عمر کو چوٹ لگتی وہ اتنا واویلا کرتا کہ معمولی چوٹ، شدید نوعیت کی معلوم ہوتی۔ جب کبھی اسے بخار یا سر درد ہوتا تو گھر والوں کی شامت آ جاتی۔ چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھا لیتا۔ وہ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ذہین، پانچ وقت کی نماز کا پابند، اچھے بچوں والی تمام خوبیاں تھیں اس میں سوائے صبر کے۔ صبر نام کا لفظ اس کی لغت میں نہ تھا۔

''یہ چوٹ کیسے لگی تمہیں؟'' آپی عمر کے برابر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''میں گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ رن لیتے ہوئے گر گیا۔'' عمر نے جواب دیا۔ ''اچھا، اب میں آپ کو چند ضروری باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ توجہ سے سننا۔ دیکھو عمر، تکلیف، بیماری اور مصائب انسان کی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ جب کبھی یہ ہم پر آئیں تو انسان کو چاہیے کہ وہ صبر کرے۔ اللہ کا ارشاد ہے: واللہ یحب الصابرین۔ ''اللہ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔'' بعض اوقات چھوٹی بیماریاں، بڑی اور خطرناک بیماریوں سے بچاؤ کا سبب بنتی ہیں، جیسے کھانسی، فالج کے اٹیک اور نزلہ و زکام، دماغ کی خشکی سے محفوظ رکھتا ہے۔ صبر کی چار اقسام میں سے ایک قسم آفت و مصیبت پر صبر کرنا ہے، جس کے بدلے انسان کو بروز قیامت اللہ جنت میں سات سو درجات عطا فرمائے گا۔ ہر درجے کا فاصلہ عرش سے تحت الثریٰ تک کا ہوگا۔

اس لیے عمر جو آدمی اللہ کے عذاب سے بچنا، ثواب و رحمت حاصل کرنا اور جنت میں جانا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات سے روکے اور مصیبت پر صبر کرے۔ ان باتوں کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تم جب کبھی بیمار ہو تو صبر کرو اللہ سے معافی و عافیت مانگو تاکہ تمہیں صحت و تندرستی ملے کیوں کہ بیماری ذریعہ نجات ہے۔ یہ ہمارے گناہوں کو مٹا کر ہمیں پاک صاف کر دیتی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا: جو ایک شب بیمار رہا۔ اس نے صبر کیا، اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہا، تو وہ گناہوں سے اس طرح نکل گیا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو۔ (مکاشفۃ القلوب)''

''آپی میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کسی بھی تکلیف پر واویلا کرنے کے بجائے صبر کروں گا۔'' عمر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''شاباش۔'' آپی نے مسکراتے ہوئے عمر کے کندھے کو تھپتھپایا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

(نوریہ مدثر، سیالکوٹ)

دردِ دل کے واسطے

''اور آج تھر میں مزید پانچ کلیاں مرجھا گئیں۔ ناکافی خوراک کے سبب جسم میں قوت مدافعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ قحط سے مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور......''

ٹی وی پر خبریں جاری تھیں۔ عبداللہ نے چینل بدلنا چاہا تو ایک ٹاک شو پر رک گیا۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے راہنما اپنے اپنے بیان دے رہے تھے۔ عمر نے ٹی وی بند کیا اور باہر چلا گیا مگر اس کے ذہن پر تمام مناظر چھائے ہوئے تھے۔ کمزور، نحیف، دبلے پتلے تین بچے اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ عمر کا تعلق اونچے گھرانے سے تھا۔ اس کے نزدیک زندگی صرف عیش کرنے کا نام تھی۔ اس نے کبھی اپنے سے کم لوگوں کی مشکلات کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ آج پہلی بار موت کا رقص دیکھ کر اس کی روح کانپ گئی تھی۔

عبداللہ شام کو گھر آیا تو کھانے کا سوچا مگر لقمہ جیسے پیٹ میں اترنے سے انکاری تھا۔ وہ اپنی دادی کے پاس گیا اور انہیں ساری کیفیت بتائی۔ ''بیٹا! زندگی عیش و عشرت کا نام نہیں ہے۔ ہمیں اللہ نے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ ہمیں دوسروں کا احساس کرنے کا کہا گیا ہے۔ اللہ رب العزت کہتا ہے کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی کی مدد فرمائی تو اللہ روز محشر اس کی مدد کرے گا۔ اس کی تکلیف دور کرے گا۔ اور اللہ پاک کہتا ہے کہ جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی گویا اس نے ساری انسانیت کی جان بچائی۔

بیٹا! یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ ہر شخص نے اپنا بویا خود کاٹنا ہے۔ اللہ نے تمہیں توفیق دی ہے تو انسان ہونے کا حق ادا کرو۔''

عبداللہ کو احساس ہو رہا تھا کہ ابھی تک وہ غفلت میں پڑا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر تینوں بچوں کی مدد کرے گا۔ عبداللہ نے فوراً اپنے منیجر کو بلایا اور خوراک کا سامان بڑے ڈبوں میں رکھنے کی ہدایت دی۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ کھوکھلے

دعوے کرنے والوں میں شامل نہیں۔ اس نے سجدہ شکر ادا کیا کہ اس ذات پاک نے بروقت اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے اب یہی مقصد تھا کہ: ''درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔''

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

پچھتاوا

(عبداللہ محمود، بھالیہ)

نعیم ساتویں کلاس کا ہونہار طالب علم تھا۔ وہ پہلی کلاس سے اوّل آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ گھر والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ساتویں کلاس میں اس کی دوستی عمیر احمد سے ہوگئی۔ عمیر کلاس میں نیا ہی آیا تھا۔ عمیر کو پڑھائی میں ذرہ برابر بھی دل چسپی نہیں تھی بلکہ اکثر وہ کلاس میں بھی زیادہ ٹائم کھیلتا رہتا۔

ایک دن عمیر نے نعیم کو کمپیوٹر کے متعلق بتایا کہ وہ ہر روز اس پر گیم کھیلتا ہے، پینٹنگز بناتا ہے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ نعیم کو کمپیوٹر میں زیادہ دل چسپی ہونے لگی۔ نعیم کے ابو، شہر کے ممتاز تاجر تھے۔ وہ نعیم کو بھی کام یاب تاجر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کی پڑھائی پر زیادہ زور دیتے تھے کیوں کہ کام یابی کے لیے پڑھائی ضروری ہے۔ پھر ہونا کیا تھا...... بچو! جیسا کہ سب جانتے ہیں، جب آپ ضد کرتے ہیں تو آپ کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔ بالکل اسی طرح نعیم کی ضد کے آگے ابو جان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے، ایک کمپیوٹر کا بندوبست کر دیا۔

بس اب کیا تھا، اسکول اور ٹیوشن کے بعد نعیم صاحب تھے اور ان کا کمپیوٹر۔ جب وہ کمپیوٹر کو استعمال نہ بھی کر رہے ہوتے پھر بھی سوچ رہے ہوتے کہ آج یہ کروں گا، وہ کروں گا۔ کلاس میں عمیر کے ساتھ گپ شپ اب خوب جمنے لگی۔ کچھ عرصے بعد ٹیوشن سے چھٹیاں کرنے لگے۔ کبھی پیٹ کے درد کا بہانہ اور کبھی بخار کا ڈرامہ۔ نعیم کی امی جان سب جانتی تھیں کیوں کہ جیسے ہی اسکول کا وقت ختم ہوتا اور ابو دفتر چلے جاتے، نعیم صاحب جھٹ سے اُٹھ بیٹھتے اور کمپیوٹر آن کر لیتے۔

اب امتحانات سر پر آگئے۔ اب بھی نعیم نے کمپیوٹر کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مجبوراً امی جان نے ابو سے شکایت کی اور کمپیوٹر کو امتحانات کی وجہ سے بند کر دیا۔ اب نعیم صاحب اُداس رہنے لگے۔ کتاب کھولتے تو پڑھنے کو جی نہ چاہتا۔ ریاضی کی مشق کرنے کو بیٹھتے تو سوالات کی سمجھ نہ آتی کیوں کہ کلاس میں دھیان جو نہ دیا تھا اور نہ ہی ہوم ورک پر توجہ دی تھی۔

امتحان شروع ہوئے اور ایک ایک کر کے تمام ہوئے۔ نعیم صاحب کے ہر پیپر میں ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ ہر سوال آدھا آدھا حل ہوتا۔ یہی حال عمیر کا تھا بلکہ عمیر کا تو آدھا سوال بھی حل نہ ہوتا۔

پھر نتیجے کا دن آیا۔ ہر کوئی حیران بلکہ پریشان تھا کہ اوّل پوزیشن لینے والا طالب علم فیل کیسے ہو گیا۔ جی ہاں، بچو! نعیم شہزاد فیل ہو چکے تھے۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عمیر احمد کا کیا بنا۔ غرض گھر واپسی پر شہزاد صاحب اور امی جان، بے حد افسردہ تھے۔ ہر بار اوّل آنے پر تحفے ملتے تھے مگر اس دفعہ مارے ندامت کے نعیم کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ امی نے نعیم کو پیار سے سمجھایا اور اس کی پڑھائی کے لیے باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنایا گیا۔ کمپیوٹر کے لیے صرف ایک گھنٹا رکھا گیا۔ کلاس میں بھی نعیم نے سیٹ تبدیل کر لی اور سالانہ امتحانات کی تیاری زور و شور سے شروع کر دی۔ پھر سالانہ امتحان کا نتیجے کا اعلان کرتے ہوئے پرنسپل نے کہا کہ ساتویں کلاس میں اوّل آنے والے طالب علم کا نام...... نعیم شہزاد ہے۔

انعام وصول کرتے ہوئے نعیم کی نظر والدین پر پڑی جو خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ نعیم نے سوچا، واقعی میری کام یابی میں ہی والدین کی خوشی ہے۔

یہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے مگر پیارے بچو! آپ نے بھی نعیم کی طرح محنت کرنی ہے۔ آپ نے سنا تو ہوگا کہ ''ہر کام کی زیادتی بُری ہوتی ہے۔'' بالکل اسی طرح کھیل کود میں زیادہ وقت دینا بھی آپ کو نالائق بنا دے گا۔ کام کے وقت کام اور کھیل کے وقت کھیل، اور یاد رکھیے گا آپ کی کام یابی میں ہی والدین کی خوشی ہے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

یادگار تحفہ

(سفیان شاہد شیخ، گوجرانوالہ)

عمر کے لیے یہ بہت خوشی کا دن تھا کیوں کہ آج اس کی سال گرہ کا دن تھا۔ اس کے دوستوں نے اس کو بہت سے تحفے دیے۔ عمر کے والد صاحب جو اس ملک میں نہیں تھے، انھوں نے بھی عمر کو سعودی عرب سے تحفہ بھیجا۔ عمر کو وہ تحفہ بھی بہت پسند آیا۔ چند مہینے بعد اس کے لیے ایک اور خوشی کا دن آیا۔ وہ دن اس کے سب سے اچھے دوست علی کی سال گرہ کا دن تھا۔ اس دن عمر بہت خوش تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک پریشانی میں بھی مبتلا ہو گیا۔ پریشانی یہ کہ

وہ علی کو اس کی سال گرہ پر کون سا تحفہ دے۔ عمر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کو ایک واقعہ یاد آیا۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک روز علی نے عمر کو اپنے گھر بلایا کہ دونوں ساتھ میں پڑھیں گے۔ ابھی وہ پڑھ ہی رہے تھے کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ عمر نے فوراً وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے علی سے جائے نماز مانگی۔

علی اور اس کی بہن نے فوراً ایک زبان ہو کر کہا: ''ہمارے گھر تو جائے نماز نہیں ہے۔''

عمر نے علی کو پھر جائے نماز ہی تحفے میں دینے کا سوچا۔ عمر نے اپنی امی سے علی کو تحفہ دینے کے لیے پیسے مانگے۔ اس کی امی جان نے فوراً اس کو پیسے دے دیے۔ عمر نے اپنی امی کے ساتھ مل کر علی کے لیے ایک خوب صورت جائے نماز کا تحفہ تیار کیا اور وہی تحفہ اس نے علی کو اس کی سال گرہ پر دے دیا۔ علی کو جائے نماز بہت پسند آئی۔ اور اس نے عمر سے کہا کہ یہ تحفہ بہت اچھا ہے۔ اس نے عمر کا شکریہ ادا کیا۔ عمر کے لیے وہ دن بہت یادگار تھا۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

جانوروں کی حیرت انگیز قدرتی صلاحیتیں

سیلامینڈر

سیلامینڈر اصل میں جل تھلیہ چھپکلی کی ایک ایسی قسم ہے جو اپنے جسم کے اگلے اور پچھلے پیروں اور اپنی دُم کو کاٹنے یا زخمی ہونے کی صورت میں دوبارہ اُگا سکتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ اپنے دل، دماغ اور دوسرے اندرونی اعضاء کی بھی بار افزائش یعنی (Regeneration) کی صلاحیت رکھتی ہے۔

گوبریلہ

یہ ہاتھی جیسے بڑے جانوروں کے گوبر میں پلنے والا ایک سخت جان کیڑا ہے جو اپنے وزن سے تقریباً 1141 گنا زیادہ وزن اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے جب کہ چیونٹی اپنے وزن کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ وزن اُٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ایل (EEL)

یہ ایک لمبوتری مچھلی ہے جو اپنے جسم کے خاص اعضاء میں موجود خلیوں کی مدد سے اپنے جسم میں بجلی پیدا کر لیتی ہے۔ یہ تقریباً 600 وولٹ تک بجلی پیدا کر لیتی ہے جو کسی بھی عام انسان کو مارنے کے لیے کافی ہے۔

چھپکلی (گیکو)

گھروں میں پائی جانے والی چھپکلیوں میں دیوار پر چلنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ چھپکلی کے اگلے اور پچھلے پیروں میں موجود تلووں پر باریک باریک بال ہوتے ہیں جو کسی بھی چیز کے ساتھ ایک کیمیائی بونڈ بنا لیتے ہیں جس کی مدد سے یہ شیشے یا چکنی دیواروں پر بھی ایک میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چڑھ سکتی ہے اور صرف ایک انگوٹھے پر اپنے سارے وزن کے ساتھ کئی گھنٹوں تک لٹک سکتی ہے۔

(خالد نثار، ہنگو)

گھومنے والا درخت

وسطی افریقہ کے بالٹی گاؤں میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو گھوم سکتا ہے۔ تند و تیز طوفان اور بارش میں جب دوسرے درختوں کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں تو اس درخت کی جڑیں چاروں طرف گھومتی ہیں۔ اس طرح ہوا کے زور کا مقابلہ کرنے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔ مقامی لوگ اس درخت کو مقدس قرار دیتے ہیں یہ ان کی اپنی سوچ ہے۔

(محمد مصحف الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان)

گرد کس چیز کی بنی ہوتی ہے؟

گرد دراصل انتہائی چھوٹے چھوٹے مٹی کے ذرات ہوتے ہیں جو ریت کے ذرات سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ گرد کے ذرات میں جانوروں کے چھوٹے چھوٹے بال اور کوڑا کرکٹ ہوا کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔

سینڈوچ کو یہ نام کیسے دیا گیا؟

سینڈوچ دراصل برطانیہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اٹھارہویں صدی میں اس جگہ کے مالک کا نام ''جون مونٹاگو'' تھا۔ یہ اپنے خاندان کا چوتھا نواب تھا اور ان کو تاش بہت پسند تھی۔ وہ بعض اوقات کھانا کھانا بھی بھول جاتا۔ ان نے ایک ترکیب نکالی اور اپنے ملازم سے کہا کہ وہ اس کو ڈبل روٹی کے درمیان تلا ہوا گوشت کا ٹکڑا رکھ کر دیا کرے۔ یوں موجودہ سینڈوچ کی ابتدا ہوئی۔

(ایمان زہرہ، لاہور)

کہیں دو بہن بھائی معاذ اور تزئین رہتے تھے۔ دونوں کی عمریں تقریباً آٹھ سے دس سال تھیں۔ معاذ چھوٹا تھا اور ہمیشہ صبح سویرے اُٹھتا تھا لیکن تزئین کا ہر وقت دل کرتا تھا کہ وہ سوئی ہی رہے۔ وہ کبھی صبح سویرے نہیں اُٹھتی تھی۔ وہ سارا دن جمائیاں لیتی رہتی اور رات ہوتے ہی پلنگ پر پڑے بستر میں سونے کے لئے گھس جاتی۔ امی جان صبح اسے جگاتے جگاتے تھک جاتیں لیکن تزئین ٹس سے مس نہ ہوتی۔ وہ پھر اسے یاد کرواتیں کہ اسکول سے دیر ہو جائے گی۔ تزئین منہ ہی منہ میں ان کو کہتی کہ ابھی اُٹھتی ہوں لیکن اس سے اُٹھا نہیں جاتا تھا۔ اس کی امی اس کے کپڑے پکڑ کر اس کو جھڑکیاں بھی دیتیں اور آخر کار تھک ہار کر اس کے کمرے سے چلی جاتیں۔ تزئین ان کے جانے کے بعد اپنے کپڑے درست کرتی اور پھر سو جاتی۔ وہ کبھی بھی ناشتا وقت پر نہیں کرتی تھی اور اکثر اسکول سے بھی لیٹ ہو جاتی تھی۔

ایک دن تو امی کا تزئین کے کمرے میں جانے کو دل ہی نہ چاہا بلکہ انہوں نے معاذ کو حکم دیا کہ وہ اپنی بڑی بہن کو جگائے اور اس کے منہ پر ٹھنڈا پانی بھی ڈالنا پڑے تو بے شک ڈال دے یا اگر اس کا لحاف بھی اُتارنا پڑے تو اُتار دے۔ اسے سردی لگنے دے لیکن کسی طرح اسے وقت پر جگا دے۔ معاذ نے امی سے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں کیوں کہ وہ تزئین تھی۔ اس پر ٹھنڈا پانی ڈال بھی دیں، تب بھی وہ سوئی رہتی تھی۔ اگر سوتے میں اسے اس بات کا احساس ہو جاتا کہ اس کے اوپر سے کسی نے لحاف کھینچ لیا ہے تو وہ اپنے گھٹنے پیٹ کے اندر کر کے سو جاتی تا کہ اسے سردی کم لگے۔ معاذ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ناکام ہوا لیکن اس کو یاد آیا کہ اس کے ایک ہم جماعت کی نانی اماں بہت ہی مفید مرکبات بناتی ہیں۔ وہ بہت مہربان عورت تھیں اور ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ معاذ نے سوچا کہ تزئین کی سونے والی بیماری کا تذکرہ نانی اماں سے کرنا چاہیے۔

اگلے دن شام کو وہ نانی اماں کو ملنے ان کے گھر گیا۔ وہ ان کے قصبے سے باہر رہتی تھیں اور ان کے گھر کے آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ نانی اماں نے دروازے پر دستک سنی تو خود ہی دروازہ کھولا۔ وہ معاذ کو دیکھ کر مسکرائیں اور پوچھا: ”ہاں، معاذ بیٹا! خیریت ہے، کیا تم کسی کام سے آئے ہو؟“ معاذ نے انہیں اپنی مشکل بتائی۔ نانی اماں نے معاذ کی بات سنی۔ اس کی بات سنتے وقت نانی اماں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ انہوں نے معاذ کی بات سن کر کہا: ”ہمیں ضرور اسے ٹھیک کرنا چاہیے، ورنہ وہ ترقی نہیں کر سکتی۔“ معاذ نے ان کی بات سن کر حیرت سے انہیں پوچھا کہ کیا وہ تزئین کو ٹھیک کر سکتی ہیں، نانی اماں مکمل پُراعتماد نہیں تھیں۔ وہ اپنی ایک پُرانی الماری کے پاس گئیں اور اسے کھولا۔

معاذ الماری کی دراز میں پڑی چیزوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دراز میں مور کے پَر، جگ مگ کرتے ہوئے ذرّات اور پریوں جیسی گڑیائیں تھیں۔ چمکیلی تتلیوں کے پَر تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے اور چھوٹی چھوٹی بوتلیں نہایت دلفریب رنگوں کے محلول سے بھری ہوئی تھیں۔ نانی اماں نے ایک پیلے رنگ کا چھوٹا سا ڈبہ نکالا اور اسے کھولا۔ اس ڈبے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ستارے پڑے ہوئے تھے جو بہت بھڑکیلے تھے اور ان میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ نانی اماں نے ان میں سے تین ستارے نکالے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر معاذ کو دکھائے اور بتانے لگیں کہ یہ ہر نیند کے مارے کا مستند علاج ہے۔ اگر ایک ستارہ سوتے ہوئے نیند کے مارے کے تکیے تلے رکھ دیا جائے تو وہ اگلے دن ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر نہ ٹھیک ہو تو اگلی رات دوسرا ستارہ اور پھر بھی نہ ٹھیک ہو تو تیسری رات تیسرا ستارہ رکھا جانا چاہیے۔ اس کے بعد کوئی بھی نیند کا مارا صبح دیر تک نہیں سو سکے گا لیکن ایک مسئلہ ہے کہ یہ ستارے بہت پرانے ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے اپنا جادو کھو چکے ہوں۔ میں ان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل کسی کے کام نہ آئیں لیکن پھر بھی ایک دفعہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ معاذ نے ستارے لے کر نانی اماں کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی جیب سے خالی ماچس نکالی اور پھر تینوں چمکتے ستارے اس میں حفاظت سے رکھ لیے۔ وہ اتنے شان دار چمک رہے تھے کہ دور ہی سے جادوئی معلوم ہوتے تھے۔ اس نے نانی اماں سے پوچھا کہ یہ ستارے نیند کے ماروں کو کیسے جگاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ پلنگ سے چرچرانے کی ایسی آوازیں نکلتی ہیں جو نیند کے مارے کو خوف زدہ کر دیتی ہیں اور وہ فوراً جاگ اٹھتا ہے۔ انہوں نے معاذ کو کہا کہ اسے یہ سب کچھ ہوتا دیکھنا چاہیے۔

معاذ نے نانی اماں کا شکریہ ادا کیا اور دوڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس کیا حیرت انگیز راز تھا! اس نے ایک دفعہ پھر تینوں ستاروں کو نکالا اور انہیں غور سے دیکھتا ہوا سوچنے لگا کہ کیا یہ واقعی اتنے طاقت ور ہیں کہ تزئین جیسی سست اور نیند کی ماری لڑکی کو ٹھیک کر دیں گے کیوں کہ صرف پلنگ کے چرچرانے سے تزئین کا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ تینوں ستارے ایک ہی دفعہ تزئین کے تکیے کے نیچے رکھ دے، اس سے امید ہے کہ اس کے پلنگ میں ایسی زور زور کی آوازیں نکلیں گی جس سے شائد تزئین بھی جاگ اُٹھے۔ رات کو اس نے تزئین کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا رہنے دیا تا کہ جب پلنگ میں سے چرچرانے کی آوازیں نکلنے لگیں تو وہ دیکھے کہ تزئین پر ان کا کیا اثر پڑا۔ صبح پانچ بجے کے قریب ابھی سورج طلوع ہونے ہی جا رہا تھا اور شفق کی سنہری چادر سارے عالم پہ چھا رہی تھی۔ اس نے بہت ہی عجیب آواز سنی جس سے وہ بیدار ہوا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا اور یاد کرنے لگا، اسے سب یاد آ گیا۔ یہ تزئین کے پلنگ کی آوازیں تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تزئین صبح سویرے جاگنے سے کتنی ناراض ہو گی۔ وہ اپنے پلنگ سے اُترا اور تزئین کے کمرے کی طرف دوڑا۔ تزئین تو اپنے پلنگ پر گہری نیند سو رہی تھی لیکن اس کا پلنگ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس سے غرّانے اور چرچرانے کی آوازیں نکلیں۔ وہ اپنے اوپر پڑے ہوئے گدے کو بار بار اُچھال رہا تھا جس پر تزئین سو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھرپور جدوجہد کر رہا ہے کہ کسی طرح تزئین کو جگائے لیکن مجال ہے کہ تزئین کو کوئی فرق پڑا ہو۔ معاذ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، بڑا غیر معمولی تھا لیکن پھر اس سے بھی زیادہ خطرناک کام ہو رہا تھا۔ پتا نہیں، یہ پلنگ اب آگے کیا حرکت کرے۔ پلنگ نے اس اثناء میں اپنا دوسرا پایہ اُٹھایا اور باقاعدہ آگے کی طرف حرکت کرنے لگا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا، اس میں سے آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔

اب وہ کسی چوپائے کی طرح چاروں پیروں پہ چل رہا تھا۔ معاذ نے دھکیل کر اسے پیچھے کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا ایک پایہ اس کے پاؤں پر مارا جس سے مارے تکلیف کے معاذ اُچھلنے پر مجبور ہو گیا۔ پلنگ معاذ کو دھکیلتا ہوا دروازے سے باہر نکلا اور سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دروازے آپس میں تیز ہوا سے بج رہے ہوں۔ معاذ کو اب سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ چلّایا: ''تزئین، تزئین، جاگو! اٹھو...... تمہارا پلنگ تمہیں کہیں لے کر جا رہا ہے۔'' تزئین کو ایسا لگا جیسے حسب سابق ان کی امی اسے جگا رہی ہیں۔ اس نے ایک بار کہا کہ امی اُٹھتی ہوں اور پھر دوبارہ گھوڑے بیچ کر سو گئی۔ تزئین کو جگانا معاذ کے لئے ناممکن بات تھی۔ معاذ اپنی امی ابو کو جگانے کے لیے بھاگا لیکن پھر اس نے دیکھا کہ پلنگ کی رفتار تو بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے اُتر کر گھر کا داخلی دروازہ کھول کر باہر سڑک پر نکل چکا

تھا۔ معاذ کے پاس کسی کی مدد طلب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ جب تک ای کو جگاتا، تب تک پلنگ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کسی کو پتا بھی نہ چلتا کہ تزئین کدھر چلی گئی ہے۔ اسے اب پلنگ کے ساتھ رہ کر تزئین کو جگانے کی کوشش کرنی تھی۔ پلنگ کی چولیں ہلنے کی آوازیں ابھی بھی آ رہی تھیں اور وہ دوڑ رہا تھا۔ معاذ کو بھی اس کے ساتھ دوڑنا پڑا۔ پلنگ کی رفتار بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی معاذ کی بھی۔ پلنگ اب بھی ڈلکی چال چل رہا تھا تاکہ تزئین جاگ جائے لیکن تزئین ہی کہاں جو جاگ جائے۔ معاذ اب اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا لیکن پھر ایک موڑ آیا اور پلنگ وہ موڑ مڑ گیا۔ معاذ بھی اس کے پیچھے مڑا لیکن تب تک پلنگ اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب دُور دُور تک پلنگ کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ تو جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ اب اس کی چرچراہٹ کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ معاذ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن اس نے انہیں پونچھ دیا۔ اس کے رونے سے تزئین کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔ اسے نانی اماں یاد آئیں جنہوں نے اسے تین ستارے دیئے تھے۔ وہ فوراً ان کے پاس گیا تاکہ وہ اس کی کوئی مدد کریں۔

نانی اماں صبح صبح اسے دیکھ کر حیران ہوئیں اور جب انہیں سارے ماجرے کا علم ہوا تو وہ حیران ہو کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ آخر وہ بولیں کہ معاذ تمہیں ایک ہی بار تینوں ستارے تزئین کے تکیے تلے نہیں رکھنے چاہئیں تھے۔ ظاہر ہے اس سے تزئین کے پلنگ میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ دوڑ سکے لیکن تزئین تو پھر بھی نہیں جاگی۔ بے چارے معاذ نے نانی اماں کو بتایا تو بوڑھی عورت نے کہا کہ وہ نیند کی ماری ہے، اب ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں کیوں کہ مجھے معلوم ہے پلنگ اسے لے کر نیند کے ماروں کی سرزمین میں چلا گیا ہے۔ اب تو ہم اس کے پیچھے جا کر ہی اسے واپس لانے کی کوئی ترکیب کر سکتے ہیں۔

''تو کیا آپ میرے ساتھ جائیں گی؟'' معاذ نے دھڑکتے دل سے نانی اماں سے پوچھا۔ ''کیوں نہیں، میں اپنی کرسی پر بیٹھی ہوں اور تم میری گود میں بیٹھ جاؤ۔ یہ کرسی ہمیں نیند کے ماروں کی سرزمین پر لے جائے گی۔ وہاں ہم تزئین کو تلاش کریں گے۔'' انہوں نے معاذ کو کہا تو معاذ ان کی گود میں بیٹھ گیا۔ وہ اسے ایک کہانی سنانے لگیں۔ وہ بڑے مزے کی کہانی تھی جس سے معاذ کو نیند آنے لگی۔ وہ پہلے ہی تھکا ہوا تھا، جلد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ کرسی نے ہوا میں بلند ہونا شروع کر دیا۔ کرسی کیوں کہ آگے پیچھے ہونے والی تھی، اس لئے وہ مسلسل ایک جھولنے کی طرح آگے پیچھے ہو رہی تھی۔ آخر وہ اتنے زور سے آگے پیچھے ہوئی کہ معاذ نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور ہی نظارہ تھا۔ وہ کرسی کی بجائے ایک کشتی میں نانی اماں کے ساتھ ہو رہا تھا جو اس کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ ''ہم نیند کے ماروں کی سرزمین پر ہی جا رہے ہیں، کشتی جلد ہی ہمیں پہنچا دے گی۔'' نانی اماں نے اسے بتایا۔ ان کے اردگرد چاروں طرف سمندر پھیلا ہوا تھا اور دُور دُور تک خشکی کا نام و نشان نہیں تھا۔ سمندر کی گہرائی میں ستاروں کی طرح مچھلیاں چمک رہی تھیں۔ معاذ کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان کو پکڑ لے۔ نانی اماں نے دوبارہ معاذ کو بتایا کہ وہ پہنچنے والے ہیں۔ معاذ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن اسے کوئی زمین نظر نہیں آئی۔ پھر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس نے دیکھا کہ ان سے تھوڑا ہی آگے سمندر کی سطح پر بادلوں کی ایک سرزمین نمودار ہوئی جو بڑی ہوتی گئی جس پر عظیم الشان برجوں والے محل کھڑے تھے جن کے چمکنے کی وجہ سے ہر

طرف رو پہلی کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ ''یہی نیند کے ماروں کی سر زمین ہے۔'' نانی اماں نے سرگوشی سے معاذ کو بتایا۔ ''تمہیں یہاں شور کرنے کی اجازت بالکل نہیں ہے کیوں کہ اس سے سوئے ہوئے جاگ سکتے ہیں۔'' ''لیکن وہ کون ہیں؟'' معاذ نے پوچھا تو نانی اماں نے ہنستے ہوئے اسے بتایا کہ تمہاری بہن بھی ان میں شامل ہے۔ اس اثناء میں کشتی خاموشی سے ساحل کے ساتھ لگ گئی۔ نانی اماں اور معاذ ریت کے ساحل پر اترے۔ وہاں ہوا کا ذرہ بھر احساس نہیں تھا اور ہر جانب ہو کا عالم تھا۔ ''یہ تو کسی خواب کی مانند ہے۔'' معاذ نے سرگوشی کی۔ ''اور تمہیں پتا ہے کہ تم صرف خواب کی حالت میں یہاں آ سکتے ہو۔ چلو اب تزئین کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔'' نانی اماں نے اسے جواب دیا۔

نیلی سڑکوں پر بادلوں کے جھنڈ تھے مگر انہیں کوئی سڑکوں پر چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنی خاموشی تھی کہ معاذ کے سلیپرز کی آواز بھی خاصی بلند سنائی دے رہی تھی۔ اچانک کہیں سے ایک خرگوش نمودار ہوا جس کے لمبے کان آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ اس نے آ کر معاذ کو تنبیہ کی کہ اپنے سلیپرز اُتار لیں ورنہ اگر نیند کے ماروں میں سے کوئی جاگ گیا تو نیند کے ماروں کی سرزمین کے محافظ سیاہ گھوڑے آئیں گے اور تمہیں لے جائیں گے اور تمہین پھر کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔'' ''اوہ!'' معاذ کے منہ سے نکلا اور فوراً اس نے اپنے سلیپرز اُتار لیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی سیاہ گھوڑا آ کر اسے لے جائے۔ نانی اماں نے ایک بہت بڑے محل کی طرف اشارہ کیا اور معاذ کو بتایا کہ نیند کے مارے اس محل میں ہوتے ہیں۔ ''آؤ! محل میں چلتے ہیں۔'' وہ دونوں محل کی طرف روانہ ہو گئے جس کے روپہلے برج صبح کی کرنوں سے چمک رہے تھے اور پھر سیڑھیوں کی ایک قطار تھی جو محل تک جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ نانی اماں نے معاذ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھیں۔ جب وہ آخری سیڑھی پر پہنچے تو اچانک انہوں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ تزئین کا پلنگ چرچراتا ہوا ایک ایک سیڑھی اوپر چڑھتا ہوا آ رہا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ تزئین اب بھی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ تزئین کے پلنگ نے دھکے سے شیشے کا بنا محل کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ معاذ اور نانی اماں بھی پلنگ کے پیچھے تھے۔ محل کے اندر حیرت کے انبار بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے دونوں اطراف پلنگ بچھے پڑے تھے اور ان پر نیند کے مارے اپنی ٹانگیں پیٹ میں سکوڑے گہری نیند سو رہے تھے۔ تزئین کا پلنگ اِدھر اُدھر کمرے میں اپنے لئے جگہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اسے ایسی کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ پھر وہ ایک بغلی چھوٹے کمرے میں داخل ہوا اور اس کے کمرے میں بھی ہر جگہ پلنگ بچھے ہوئے تھے اور تزئین کے پلنگ کے لئے جگہ نہیں تھی۔ پلنگ سے نکلنے والی آوازوں سے لگ رہا تھا جیسے وہ تھک چکا ہے۔ اب وہ تیسرے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ تیسرے کمرے میں ایک پلنگ جتنی جگہ خالی تھی۔ تزئین کے پلنگ نے احتیاط سے اس خالی جگہ کو پُر کر لیا۔ اس کی چرچراہٹ میں اس دفعہ خوشی کی آمیزش تھی۔ آخر کار اس نے نیند کے ماروں کی سرزمین میں اپنے جتنی جگہ ڈھونڈ لی تھی۔ معاذ نے نانی اماں کے کان میں کھسر پھسر کی کہ ہم تزئین کو کس طرح جگا سکتے ہیں۔ نانی اماں نے اسے بتایا کہ ہم اس جگہ سونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے اور تزئین کو نہیں جگا سکتے۔ ہم صرف ایک کام کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ کسی طرح اس پلنگ کو تزئین سمیت واپس لے جائیں۔ ''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' معاذ نے حیرت سے پوچھا۔ ''اگر تم کسی طرح تزئین کے تکیے کے نیچے سے تینوں ستارے نکال لاؤ تو پلنگ کو واپس جانا پڑے گا۔ ابھی یہ یہاں کا مکمل عادی نہیں ہوا جیسے کہ دوسرے پلنگ...... یہ ابھی ابھی یہاں پہنچا ہے لیکن میں ڈرتی ہوں کہ یہ بہت ناراض ہو گا۔''

نانی اماں نے معاذ کو سمجھایا۔ معاذ چپکے چپکے بستر کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنا ہاتھ تزئین کے تکیے کے نیچے ڈالا اور تینوں ستاروں کو محسوس کیا۔ ستارے اس کے ہاتھ میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ وہ تکیے کے نیچے کسی جاندار شے کی طرح بھاگ رہے تھے بلکہ جب انہیں موقع مل رہا تھا، معاذ کے ہاتھ پر کاٹ رہے تھے۔ آخرکار بہن کی محبت میں مغلوب معاذ نے ستاروں پر قابو پا ہی لیا اور لا کر نانی اماں کو دیئے۔ نانی اماں نے معاذ کو ہاتھ سے تھوڑا پیچھے کیا اور تماشا دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی پلنگ کو معلوم ہوا کہ اس کے جادو کے ستارے چرائے گئے ہیں اور اسے اب واپس جانا ہو گا جہاں سے وہ آیا ہے، وہ اس طرح چیخا چلایا جیسے بیسیوں الماریاں چیخ رہی ہوں، حتیٰ کہ معاذ کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ حرکت میں آیا۔ اس نے پہلے اپنا ایک قدم اٹھایا، پھر دوسرا لیکن وہ بہت شور مچا رہا تھا۔ کبھی وہ کسی سے ٹکراتا، کبھی پاؤں زمین پر رکھتا اور کبھی تو غصے سے ناچنے لگتا۔ تزئین پلنگ پر اُچھل کود رہی تھی لیکن

پھر بھی جاگنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پلنگ کسی بدمست ہاتھی کی طرح اُچھلتا کودتا آخر کمرے سے باہر نکل گیا اور تب اچانک محل سیاہ گھوڑوں سے بھر گیا۔ ان کی لمبی دُمیں اور چمکیلی آنکھیں تھیں۔ وہ اپنے سم پٹخ رہے تھے۔ وہ انتہائی غصے میں تھے۔ معاذ ان کے غصے کو دیکھ کر سہما ہوا تھا۔ وہ ڈر کر ایک نیند کے مارے کے پلنگ پر چڑھ گیا مگر نانی اماں نے اسے کھینچ کر اُتارا اور اسے جھڑکا کہ تم کبھی واپس نہیں جا سکتے۔ اگر تم کسی بستر کے اُوپر چڑھ گئے، تمہیں واپس جانے کے لئے ایک سیاہ گھوڑے پر چڑھنا ہوگا۔ یہ سیاہ گھوڑے دراصل بُرے خواب ہیں اور انہوں نے گھوڑوں کا روپ دھارا ہوا ہے۔ یہ تمہیں سیدھا گھر لے جائیں گے، اگرچہ تمہیں پتا ہے کہ یہ کوئی اتنے مزے کی سواری نہیں ہوگی۔ معاذ نے ویسے ہی کیا جیسے نانی اماں نے سمجھایا تھا۔ وہ سب سے پہلے سیاہ گھوڑے یعنی سب سے زیادہ ڈراؤنے خواب پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اس کی ایال کو زور سے پکڑ لیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ سم جھٹکے اور پھر تیز دوڑ پڑا۔ معاذ اس پر چمٹا بیٹھا رہا۔

یہ واقعی کوئی مزے کی سواری نہیں تھی۔ گھوڑے کو معاذ کو تکلیف دینے میں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چاند کی سرزمین پر سرپٹ دوڑا اور پھر وہاں کی سب سے اُونچی چٹان سے گزرا جہاں سے نیچے سیاہ سمندر ہی نظر آتا تھا۔ چٹان آنے سے بجائے گھوڑا رُکتا، وہ چٹان کو ایک ہی چھلانگ میں عبور کر گیا۔ معاذ کو اپنی سانس رُکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تب کیا ہوگا، اگر وہ سمندر میں گر گیا لیکن نہیں سیاہ گھوڑے نے اپنے پَر ہوا میں پھیلائے اور انہیں پھڑ پھڑاتا ہوا چٹان کے اُوپر سے گزر گیا۔ اس نے پیچھے مُڑ کر معاذ کو دیکھا اور اسے خوف زدہ دیکھ کر خوشی سے ہنہنایا۔ وہ اب دوبارہ سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اس دفعہ معاذ کے سامنے ایک عظیم الشان دیوار آئی۔ سیاہ گھوڑا اسے پھلانگ نہیں سکتا تھا۔ گھوڑے نے ایک پھریری لی اور ہوا میں مزید بلند ہو گیا۔ معاذ سوچ رہا تھا کہ دیوار کی دوسری طرف کیا ہے۔ دیوار کی دوسری طرف معاذ نے دیکھا کہ ایک انتہائی تیز بہتا دریا ہے۔ چھپاک کی آواز سے دونوں پانی میں گر گئے۔ اب سیاہ گھوڑا تیرنے لگا۔ دو تین دفعہ تیز پانی کی بوچھاڑ معاذ سے ٹکرائی اور اس کے منہ میں بھی پانی بھر گیا۔ آخر گھوڑے نے دریا عبور کیا اور پھر سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ معاذ کو کئی دفعہ محسوس ہوا کہ وہ گر جائے گا۔ تیز ہوا معاذ کے کانوں اور نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ گھوڑے کی رفتار بڑھتی ہی جا رہی تھی مگر معاذ اس پر چمٹا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اب گھوڑا بھی تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ پھر اس کے سم کسی خرگوش کے بھٹ میں اٹکے اور اُوپر بیٹھا ہوا معاذ ہوا میں بلند ہوا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ گرنے کے بعد معاذ نے آنکھیں کھولیں تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ گھر میں موجود تھا۔ وہ اپنے پلنگ سے گر کر فرش پر پڑا تھا۔ اس نے سوچا کہ کوئی دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ وہ نیند میں بستر سے گرا ہے۔ اس نے شکر کیا کہ وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔ پھر اسے تزئین کا خیال آیا۔ وہ اس کے کمرے کی طرف بھاگا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں پہنچا تزئین کا پلنگ اپنی جگہ پر فراش ہو رہا تھا۔ اس میں سے چٹخنے، چرچرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تزئین بدستور سو رہی تھی۔ جب پلنگ اپنی جگہ پر ساکن ہو گیا تو نیچے گھڑی نے صبح کے سات بجائے۔

ان کی امی جان اپنے کمرے سے باہر آئیں۔ معاذ نے تزئین کو زور سے بستر سے کھینچ لیا جس سے وہ زمین پر گری۔ پھر وہ اپنی بہن کے پاس بیٹھ گیا جو اب جاگ رہی تھی اور اسے صبح کے حیرت انگیز سفر کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کس طرح اس کے لئے نیند کے ماروں کی سرزمین پر گیا اور واپس آیا۔ تزئین کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”تمہیں پتا ہے، میں نے یہ سب خواب میں دیکھا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے جو کچھ بھی ہوا لیکن میں بیدار نہیں ہو سکی۔ سوچو معاذ! اگر میں وہیں رہ جاتی تو کیا ہوتا۔“ معاذ نے کہا کہ اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو روز صبح سویرے جاگتا اس سے پہلے کہ میرا پلنگ پھر کوئی حرکت کرتا۔ تزئین نے کہا کہ میں بھی یہی کروں گی۔ پھر وہ جلدی سے تیار ہوئی، ویسے بھی وہ اپنے بستر سے جلدی ہٹنا چاہتی تھی۔ ان کی امی حیران ہو گئیں جب انہوں نے تزئین کو ناشتے کی میز پر دو منٹ پہلے دیکھا۔ اگلی صبح جب تزئین سوئی ہوئی تھی تو پلنگ کی ایک چول ہلی۔ خدا کی پناہ! کاش، آپ تزئین کو دیکھتے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ جلدی سے تیار ہونے لگی اور اب جب اس کا پلنگ ذرا سا چرچراتا یا آواز نکالتا ہے تو تزئین بجلی کی تیزی سے بستر سے اُٹھ جاتی ہے۔ وہ روز تہیہ کرتی ہے کہ وہ نیند کے ماروں کی سرزمین پر نہیں جائے گی۔ میں اس کی اس بات پر حیران نہیں ہوتا، کیا آپ ہوتے ہیں؟

☆☆☆

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

(اسامہ ظفر راجہ، جہلم، سرائے عالم گیر)

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

(احور کامران رانا، لاہور)

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

☆

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

(تقویٰ خلیق راجہ، واہ کینٹ)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

☆

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

(مشیرہ سلیمان بٹ)

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا دیئے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا؟

☆

یہ انتقام ہے دشتِ بلا سے بادل کا
سمندروں پہ برستے ہوئے گزر جانا

(محمد قمر الزمان صائم، خوشاب)

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

(مومنہ شہزاد، راولپنڈی)

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی ہے عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہ تھا

(محمد حمزہ سعید، بورے والا)

کون سی بستی ہے ذرا آنکھ تو مل کر دیکھو
پیڑ ہر راہ میں ہے موجود، مگر چھاؤں نہیں

(مریم نایاب، خوشاب)

جگہ جی لگانے کی دُنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

(عروج جمشید، لاہور)

میں نے اس کے لب پہ کبھی بددعا نہیں دیکھی
بس اک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

☆

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(عبدالکریم، گجرات)

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ!
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

(عروج فاطمہ، لاہور)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

(محمد احمد خان غوری، بہاولپور)

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

(علینہ احمد، راولپنڈی)

کمال خاک ساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی قیامت ہوں

(کظیمہ زہرہ، لاہور)

آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے

علی اکمل تصور

چھٹی کا دن تھا۔ اس دن غضب کی گرمی تھی اور اوپر سے بجلی کی آنکھ مچولی...... انسان تو کیا جانور بھی بوکھلائے پھر رہے تھے۔ کامران نے ایک چھوٹی سی فرمائش کی تھی اور ابو نے فوراً ہی مان لی تھی۔ اب گھر میں کامران کی خواہش کی تکمیل کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ امی نے مزے دار بریانی بنائی تھی۔ کولر کو برف سے بھر لیا گیا تھا۔ کولڈ ڈرنک اور مشروبات کی بوتلیں ساتھ لے لی گئیں تھیں۔

اب گھر کے تمام افراد پکنک منانے نکلے تھے مگر کامران نے دریا کنارے جانے کی ضد کی تھی۔ ابو کو ہر اس مقام سے ڈر لگتا تھا جہاں پانی کی وافر مقدار موجود ہو۔ پھر چاہے وہ سوئمنگ پول ہو، واٹر پارک ہو یا پھر کسی نہر، جھیل یا دریا کا کنارہ ہو۔ آج بھی ابو نے بچوں سے وعدہ لیا تھا کہ پانی میں کوئی نہیں اُترے گا۔ بچوں نے خوشی سے ابو کی بات مان لی تھی۔ وہ تو بس شہر کے حبس زدہ ماحول سے نکلنا چاہتے تھے۔ کامران سب سے بڑا تھا اور سمجھ دار بھی تھا۔

پھر ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد سب دریا کنارے پہنچ گئے۔ یہاں تو پہلے ہی میلے کا سا سماں تھا۔ بچے موج مستی کر رہے تھے اور والدین انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اب کامران اپنی فیملی کے ہمراہ اس میلے کا حصہ بن چکا تھا۔ امی نے ایک درخت کے نیچے چٹائی بچھا لی تھی، یہاں نم آلود ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔

''ابو جی ہم سیر کر آئیں۔'' کامران نے التجا کی تھی۔

''ضرور...... مگر پانی میں نہیں جانا۔'' ابو نے اجازت دے دی تھی۔ کامران اور اس کے بہن بھائی اُچھلتے کودتے دریا کے کنارے کی طرف دوڑے۔ ابو بچوں پر برابر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دریا کی لہریں کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بچوں نے حکم عدولی نہیں کی تھی۔ وہ دریا کے قریب تھے مگر پانی سے دُور تھے۔ اب سب بچے کھیلنے لگے تھے۔ دوسرے بچے بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ کوئی پکڑا پکڑی کھیل رہا تھا، تو کوئی ریتلی مٹی میں پاؤں دبا کر سرنگ نما گھر بنا رہا تھا۔ کوئی ٹھوکر مار کر اس گھر کو برباد کر کے بھاگ رہا تھا، تو کوئی ٹھوکر مارنے والے کا پیچھا کر رہا تھا۔ کامران دوڑ کر دریا کنارے پہنچا تھا۔ اس کے پیچھے چند بچے اور بھی تھے۔ پھر اسی طوفانی رفتار سے کامران ابو کی طرف دوڑ پڑا۔ ابو اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''یا اللہ خیر......'' ابو نے سلامتی کی دُعا مانگی۔ کامران کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''ابو...... ابو......'' اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا اور پھر جھپٹ کر چٹائی پر سے ایک گلاس اُٹھا لیا۔ امی چٹائی پر دسترخوان سجا رہی تھیں۔ گلاس پکڑ کر کامران پھر سے دوڑ پڑا۔ ابو اسے پکارتے ہی رہ گئے۔

دوسرے بچے اب دریا کنارے دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ کامران اس دائرے میں گھس گیا۔ پھر ابو نے اسے دریا کے پانی کی طرف لپکتے دیکھا۔ کامران نے شیشے کے گلاس میں پانی بھر لیا۔ اب وہ ابو کی طرف لوٹ رہا تھا۔ بچوں کا میلہ اس کے پیچھے تھا۔ کامران کا چہرہ خوشی اور مسرت سے چمک رہا تھا۔

''ابو جی! دیکھیے...... یہ میرے پاس کیا ہے؟'' اب کامران نے گلاس پر سے اپنی انگلیاں ہٹالی تھیں۔ گلاس میں دریا کا ریتلا پانی تھا اور پانی میں ایک سنہری رنگ کی ننھی سی مچھلی موجود تھی۔

''ارے یہ کیا......؟'' ابو بھی ہنس پڑے تھے۔

''ابو جی ہم کھیل رہے تھے کہ پانی کی لہر کے ساتھ یہ مچھلی ریت پر آگری تھی۔ پہلے تو میں گھبرا گیا تھا۔ پھر اسے پانی کے بغیر تڑپتے دیکھ کر میں گلاس لینے کے لیے بھاگا۔ میری ذرا سی کوشش سے اس کی جان بچ گئی۔'' کامران کے لہجے میں جوش تھا۔

''بیٹا! اس کی جان بچانے کے لیے اسے واپس دریا کے پانی میں بھی ڈالا جا سکتا تھا۔'' ابو نے سوال اُٹھایا اور کامران لاجواب ہو گیا تھا۔ پھر ابو مسکرا کر بولے۔

''اصل میں تمہاری نیت کچھ اور ہے......''

''ابو جی......'' کامران نے ابو کا بازو پکڑ لیا تھا۔

''کوئی بات نہیں، جہاں پہلے سے تمہارے پاس اتنی مچھلیاں موجود ہیں، وہاں ایک اور سہی۔'' ابو جی نے اجازت دے دی تھی۔ کامران کی خوشی دیدنی تھی۔ اب اس کا یہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے بس گھر پہنچ جائے۔ گھر میں اس کا ایک بڑا سا شیشے کا بکس (ایکوریم) موجود تھا جس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ کامران جلد سے جلد اس سنہری مچھلی کو ان مچھلیوں کے ساتھ چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد ہی اس اجنبی مچھلی کو ایکوریم میں موجود مچھلیاں قبول کر لیں گی۔

''ابو جی گھر چلتے ہیں۔'' کامران اصرار کرنے لگا تھا۔

''رُکو بیٹا...... کھانا کھالیں، شام کو چلیں گے۔'' امی نے گرما گرم بریانی پلیٹوں میں ڈال دی مگر اب کامران کو بریانی میں بھی مزا نہیں آرہا تھا۔ اس کی توجہ تو بس گلاس کی طرف تھی جس میں سنہری مچھلی دبکی بیٹھی تھی۔ وہ گلاس کے پیندے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس نے شاید زندگی اور موت کے فلسفے کو سمجھ لیا تھا۔ اس نے شاید سمجھ لیا تھا کہ پانی میں ہی اس کی زندگی کی بقا ہے۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی اور پھر گھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ گھر پہنچتے ہی کامران ایکوریم کی طرف دوڑا اور احتیاط کے ساتھ سنہری مچھلی کو ایکوریم میں ڈال دیا۔ شیشے کے اس بکس میں مصنوعی سمندری دُنیا آباد تھی۔ مصنوعی پودے، مصنوعی پتھر اور چٹانیں۔ پہلے سے موجود رنگ برنگی مچھلیوں کا تو یہ گھر تھا۔ وہ اس ماحول کی عادی تھیں۔ وہ لہراتیں، بل کھاتیں اپنے کھیل دکھا رہی تھیں مگر یہ سنہری مچھلی ایک کونے میں دبک گئی تھی۔ کامران کتنی ہی دیر تک اس کا مشاہدہ کرتا رہا، پھر اُکتا کر بولا۔

''ننھی مچھلی...... ڈرو مت...... چند دنوں میں یہاں تمہارا دل لگ جائے گا۔'' پھر وہ کمرے میں سے باہر نکل گیا۔ رنگ برنگی مچھلیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے درمیان ایک نیا مہمان آچکا ہے۔ اب انہوں نے اس مہمان کو گھیر لیا تھا۔ سب نے اسے خوش آمدید کہا، اپنی محبت کا اظہار کیا اور پھر پوچھا۔

''تم ہمارے جیسی نہیں لگتی...... کون ہو تم اور کہاں سے آئی ہو؟'' چند لمحوں تک سنہری مچھلی خاموش رہی۔ وہ بہت غمگین تھی۔ جب کسی کا سہانا خواب ٹوٹتا ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ تو پھر جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ پھر وہ کرب سے بولی۔

''میں نے جب آنکھ کھولی تو میرے اردگرد میرے سینکڑوں بہن بھائی موجود تھے۔ ہم ہمیشہ اپنی امی کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ پانی کے نیچے اپنی دُنیا میں ہم خوش تھے۔ کبھی کبھی اپنی امی کے ساتھ پانی کی سطح پر آتی تھی۔ میں غور کرتی تھی کہ پانی کی سطح پر کبھی تو تیز اُجالا ہوتا تھا اور کبھی تاریک اندھیرا۔ میں اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ پانی کے باہر بھی ایک دُنیا آباد ہے مگر وہ دُنیا کیسی ہے...... اب میرے من میں یہ اشتیاق پیدا ہونے لگا تھا۔ میں پانی سے باہر منہ نکالتی تو جانے کیوں میرا دم گھٹنے لگتا۔ میرے سوالوں کا امی کے پاس کوئی جواب موجود نہیں تھا اور دُنیا دیکھنے کی تڑپ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ پھر اسی جنون کے عالم میں آج میں نے خود کو دریا کی ایک جوشیلی لہر کے حوالے کر دیا۔ لہر نے مجھے ساحل پر پھینک دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں تڑپنے لگی تھی۔ میرا سانس گلے میں اٹک کر رہ گیا۔ چند لمحوں کی دیر تھی کہ میں مرجاتی۔ ایسے میں اچانک کسی نے مجھے اُٹھا لیا اور میں

نے خود کو ایک تنگ سی جگہ پر پایا۔ میں زندہ تھی، پانی میں موجود تھی، میں دُنیا دیکھ رہی تھی مگر اچانک مجھے ایک احساس ہوا کہ اب میں قید ہو چکی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہاں ہم سب قید ہیں۔ میں نے اپنی دُنیا چھوڑ کر غلطی کی...... بہت بڑی غلطی۔

سنہری مچھلی کی کہانی عجیب سی تھی۔ بہت سی رنگ برنگی مچھلیوں کو اس کہانی کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ ان میں فرق صرف اتنا سا تھا کہ سنہری مچھلی نے دریا کے نیچے ایک آزاد اور وسیع دُنیا دیکھی تھی مگر رنگ برنگی مچھلیاں پالتو تھیں۔ انہوں نے ایک فش فارم میں آنکھ کھولی تھی۔ انہیں شعور ہی نہیں تھا کہ اس فش بکس کے باہر کھلے پانیوں میں ان کے لیے کیسی زندگی موجود ہے۔ سنہری مچھلی بہت اُداس رہتی تھی اور اب تو فش بکس میں موجود میٹھا پانی نمکین ہونے لگا تھا۔

''اے اللہ! مجھے اس قید سے رہائی دلا۔ مجھے میری ماں اور بہن بھائیوں کے پاس واپس بھیج دے۔'' اب اس سنہری مچھلی کی زبان پر یہی دعا رہتی تھی۔ ......☆......

یہ چھٹی کا دن اور صبح کا وقت تھا۔ نوید اپنے ابو کے ہمراہ بازار آیا۔ چھٹی والے دن گھر کے تمام افراد گرما گرم حلوہ پوری کا ناشتا کیا کرتے تھے۔ چوک میں ایک منظر دیکھ کر ابو اور نوید ٹھٹھک کر رک گئے۔ چند لوگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ دائرے کے اندر کیا تھا، یہ جستجو انہیں دائرے تک لے آئی۔

دائرے کے اندر ایک شکاری موجود تھا۔ اس شکاری کے پاس ایک بڑا سا پنجرہ تھا اور اس پنجرے میں لاتعداد جنگلی چڑیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ وہ پنجرے کی جالیوں کے ساتھ سر ٹکرا رہی تھیں۔ بے بسی ان کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ ''پچاس روپے کی ایک...... پچاس روپے کی ایک......'' وہ شکاری آواز لگا رہا تھا۔

''اور ساری کتنے کی ہیں؟'' ابو کی آواز غم سے بوجھل تھی۔ شکاری حساب کتاب لگانے لگا۔ پھر وہ میلے دانت نکال کر بولا۔

''ویسے تو تین ہزار سے زیادہ کا مال ہے، مگر اگر آپ تمام خریدنا چاہیں تو میں خصوصی رعایت کر دوں گا۔ ڈیڑھ ہزار......'' ابو نے اپنی جیب میں سے ایک ہزار روپے کا نوٹ نکالا تھا۔

''کام چل جائے گا۔'' شکاری نے جھپٹ کر ہزار روپے کا نوٹ لے لیا۔ ''چل جائے گا، جی چل جائے گا۔'' ابو نے اس سے پنجرہ لے لیا اور پھر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چڑیاں پھدک پھدک کر باہر نکلنے لگی تھیں۔ ایک پل میں فضا میں چڑیوں کا میلا لگ گیا۔ چوں...... چوں کرتے خوشیوں کی چہکار تھی۔ اب ابو شکاری کی طرف پلٹے۔ وہ دکھ اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں بولے۔

''ان آزاد پرندوں کو قید کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم نے کبھی سوچنے کی ضرورت محسوس کی کہ رزق کے لالچ نے انہیں تمہارا قیدی بنا دیا، مگر تم نے کتنی ہی ماؤں کو ان کے انڈوں اور بچوں سے دُور کر دیا۔ تم نے دوہرا گناہ کیا ہے۔ جن انڈوں کو ماں کے جسم کی گرمی نہیں ملے گی وہ خراب ہو جائیں گے اور جن بچوں کو چوگا نہیں ملے گا، وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے؟''

''کیا کروں صاحب...... روزی روٹی کا معاملہ ہے۔'' اس شکاری کا سر جھک گیا تھا۔

''محنت کرو...... ظلم مت کرو......'' ابو نے یہ آخری بات کہی اور چل پڑے۔ اب ہجوم میں موجود لوگ بھی تتر بتر ہونے لگے تھے۔

''ابو جی...... آپ نے چڑیوں کو آزاد کیوں کر دیا...... گھر میں رکھ لیتے۔ اچھی خاصی رونق لگ جاتی۔'' نوید نے مچل کر کہا۔

پرندے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ فضا میں اُڑنا ان کی زندگی ہے۔ پرندے فطرت کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں اور انسانوں اور فصلوں کی بقا کے ضامن اور فائدہ مند ہیں۔ ان کو آزاد ہی رہنا چاہیے۔ ان کی قید فطرت کی موت ہے۔

ابو جی اور نوید آگے نکل گئے تھے۔ کامران ان کے پیچھے تھا۔ پھر وہ کھویا کھویا سا گھر واپس لوٹ آیا۔ کامران فش بکس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ایک مچھلی پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔ جب کوئی مچھلی مر جاتی تو سطح پر آ جاتی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا مگر کامران پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس مردہ مچھلی کی موت تیر کی طرح کامران کے دل پر لگی تھی۔ اچانک ہی اسے تمام مچھلیاں اُداس نظر آنے لگیں۔ آخر وہ سب قیدی ہی تو تھیں۔

''میں تم سب کو آزاد کر دوں گا۔ آخر سمندر کی دُنیا ہی تمہارا گھر ہے۔ تم سمندری دُنیا کی خوب صورتی ہو۔ یہ شیشے کا صندوق تمہارے لیے قید خانہ ہے۔'' کامران نے زیرِ لب خود سے کہا۔

رات کو ابو جب گھر لوٹے تو کامران ان کے پاس چلا آیا۔

''ابو جی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ایک کام ہے جو میں آپ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔'' اس کی بات سن کر ابو جی ایک لمحے کے لیے تو پریشان ہو گئے۔

''خیر تو ہے بیٹا......؟'' ابو جی جلدی سے بولے۔

''ابو جی آپ صبح مجھے دریا پر لے جایئے گا اور ساتھ میں مجھے فش بکس کو بھی لے کر جانا ہے۔''

''کیا اور مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام ہے۔'' ابو جی ہنس پڑے تھے۔

''نہیں...... تمام مچھلیوں کو آزاد کرنے کا پروگرام ہے۔''

''کیوں؟'' ابو جی حیران رہ گئے۔

''مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ میں کتنا ظالم ہوں۔ میں نے کتنے عرصے تک ایک آزاد مخلوق کو غلام بنائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دیں گے ناں...... وہ مجھ سے خوش ہو جائیں گے ناں۔''

''میرا پیارا بیٹا......'' جانے کیوں ابو کی آنکھیں بھی چھلکنے لگی تھیں۔ سنہری مچھلی کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ بس آج رات کی قید...... اور پھر کل کی صبح اپنے ساتھ ان سب کے لیے آزادی کا پیغام لانے والی تھی۔

☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والوں کے نام

محمد عرفان اقبال، لودھراں۔ مسز محمد اکرم صدیقی، احسن رضا، میانوالی۔ ایدال شفقت، اکوڑہ خٹک۔ اذکی آصف، پشاور۔ محمد حمزہ، لاہور۔ محمد انس، راول پنڈی۔ توقیر احمد، گوجرانوالہ۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ حبیب حسنین، دینہ۔ عماد جاوید، قصور۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ حسنہ یاسر گوندل، گوجرانوالہ۔ سعد جمیل، پھالیہ۔ احمد حسین چشتی، ڈیرہ غازی خان۔ فاطمہ جیلانی، محمد اواب خالد، محمد فرحان سعید، لاہور۔ شاہ زیب حسن، پشاور۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ اسد عبداللہ، ملتان۔ امیر سلطان، سرگودھا۔ علینا اختر، کراچی۔ فاطمہ نور، شیخوپورہ۔ حافظہ حامدہ ذوالقرنین، بہاول پور۔ محمد افنان ملک، ملتان۔ دعا نبیل، سرگودھا۔ ثمن رؤف، لاہور۔ قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ منزہ بتول، گجرات۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ نجم السحر، ملک وال۔ شفا زرتاب، لاہور۔ سندس آسیہ، کراچی۔ ملیحہ مہرین، واہ کینٹ۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ محمد حسن محمود، محمد عبداللہ، لاہور۔ محمد ابوبکر، یاسر گوندل، گوجرانوالہ۔ حافظ حبیب اللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد عبداللہ راشد، کوٹ مومن۔ رمشاء، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ صفی الرحمان، لاہور۔ محمد شاس جاوید، پھول نگر۔ حفصہ بیگ، بہاول پور۔ عدن فاطمہ، لاہور۔ عبیداللہ، فیصل آباد۔ آمنہ شاہ زیب چاند، گوجرانوالہ۔ محمد عمیس خان، ڈیرہ غازی خان۔ حافظ شاہ عروج، فیصل آباد۔ آمنہ شجاعت، لاہور۔ ماموں شفقت، اکوڑہ خٹک۔ مہر اکرم، لاہور۔ نائمہ تحریم، کراچی۔ اسماء اسلم، ملتان۔ محمد جنید ندیم، سرگودھا۔ حافظ محمد حسن، فیصل آباد۔ محمد سعد علی، لاہور۔ محمد حیان قریشی، پشاور۔ محمد خان، علیمین کشف، عائشہ ذوالفقار، مطیع الرحمان، لاہور۔ نسرین جمیل، نمرہ وحید، پشاور۔ طلحہ قیوم، لاہور۔ ایوب ناصر، کوئٹہ۔ فاطمہ طفیل، گجرات۔ ساجدہ حبیب، ساہی وال۔ ہنین، جھنگ۔ احور کامران، کظیمہ زہرہ، محمد عبداللہ، محمد احمد، زل، لاہور۔ عبدالناصر، گجرات۔ شاہ نور، ملتان۔ ارحم خان، گوجرانوالہ۔ محمد سعد، وزیر آباد۔ سامعہ منیر، لاہور۔ جاوید اقبال، کوئٹہ۔ ربیعہ نسرین، نادرہ زیدی، پشاور۔ شکیلہ نذیر، کشور ملک، راول پنڈی۔ یونس خان، فیصل آباد۔ جانفزا فاطمہ، ملتان۔ روحی ناز، بشریٰ کامران، پیرمحل۔ جلیل خان، کراچی۔ طلال خان، ساہی وال۔ قادر حسین، طاہر نذیر، جاوید نذیر، حاجی فیروز، لاہور۔ قیوم ظفر، تلہ گنگ۔ زہرہ فاطمہ، کراچی۔

آج سے کئی سو سال پہلے ہندوستان میں بیجو نام کا ایک گویا تھا، جس کے گانے کی دھوم سارے ملک میں مچی ہوئی تھی لیکن اسے ظاہری شان و شوکت سے نفرت تھی اور وہ شہروں سے دور ایک جنگل میں رہا کرتا تھا۔ لوگ اسے باورا یعنی باؤلا (پاگل) کہتے تھے اور وہ بیجو باورا کے نام سے مشہور تھا۔

یوں تو بیجو باورا کے بے شمار شاگرد تھے مگر ان تمام شاگردوں میں گوپال نایک اس کا سب سے لائق اور ہونہار شاگرد تھا۔ بیجو کو اپنے اس شاگرد سے بہت محبت تھی اور وہ اسے بڑی لگن اور شوق سے موسیقی کی تعلیم دیتا تھا۔ دن رات کی محنت اور اُستاد کی نگاہِ کرم کی بدولت جلد ہی گوپال نایک نے موسیقی کی تعلیم مکمل کر لی اور اب وہ اس چاند کی طرح روشن ہو چکا تھا جو سورج سے روشنی لے کر پوری آب و تاب سے جگ مگا اُٹھتا ہے۔

آخر کار گوپال نایک کے جانے کا وقت آ گیا۔ ایک اُستاد کو اپنے لائق شاگرد سے جیسی سچی اور بے غرض محبت ہوتی ہے، ویسی ہی محبت بیجو کو گوپال نایک سے تھی۔ اس کا دل بھر آیا اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں گوپال سے کہا:

''بیٹا گوپال، میں نے اپنی تمام زندگی کی دولت تمہیں سونپ دی ہے۔ پوری ایمان داری سے اس کی حفاظت کرنا اور محنت سے اسے بڑھاتے رہنا کیوں کہ علم کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کوئی بھی علم ہو، اپنی جگہ بہت بڑی قوت ہوتا ہے۔ دیکھو! کبھی بھول کر بھی اپنے علم کی طاقت کا بے جا اور غلط استعمال نہ کرنا۔ لوگوں کو سکون اور مسرت دینا ہی موسیقی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ بیٹے! اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا۔''

گوپال اپنے اُستاد کی دعائیں لے کر بھاری دل کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گیا۔ جلد ہی اس کے فن کی شہرت اِدھر اُدھر پھیلنے لگی اور چند برس بعد وہ وقت بھی آ پہنچا جب سارے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی۔ یہاں تک کہ دہلی کے بادشاہ نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا۔

گوپال نایک نے شاہی دربار میں اپنے فن کے وہ کمالات دکھائے کہ بادشاہ اور اس کے درباری حیرت زدہ رہ گئے۔ اس نے جلد ہی یہ ثابت کر دیا کہ ملک بھر میں اس کی ٹکر کا کوئی دوسرا موسیقار نہیں ہے۔ محنت اور لگن کبھی رائیگاں نہیں جاتی، لہٰذا وہ کچھ ہی عرصے میں شاہی دربار کا سب سے بڑا گویا بن گیا اور موسیقی کا شہنشاہ کہلانے لگا۔

اس عزت اور مرتبے کی وجہ سے گوپال کے دل میں غرور پیدا ہو گیا کیوں کہ فطرتاً وہ اچھا آدمی نہ تھا۔ کچھ دنوں بعد نوبت یہاں

تک پہنچ گئی کہ وہ اپنے مقابلے میں دوسرے موسیقاروں کو نہایت معمولی اور حقیر سمجھنے لگا۔ علم اچھے انسان میں عاجزی اور انکسار پیدا کرتا ہے اور بُرے انسان میں غرور اور گھمنڈ۔ گوپال کے اندر غرور اور گھمنڈ کی جڑیں گہری ہوتی گئیں۔ اب وہ یہ بات کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا کہ دربار میں اس کے سوا کوئی دوسرا گویا رہے۔ اس نے دوسرے موسیقاروں سے مقابلہ شروع کر دیا۔

مقابلے کی شرط اس نے یہ رکھی کہ جو گویا مقابلے میں ہارے، اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

بادشاہ کو موسیقی کا بے انتہا شوق تھا اور گوپال بغیر اس شرط کے کسی سے مقابلے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا، لہٰذا بے شمار موسیقاروں کی بیویاں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے مگر گوپال کے پتھر اور بے رحم دل میں گھمنڈ کی جو آگ بھڑک چکی تھی، وہ ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

ظلم کی یہ کہانی بیجو کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اسے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کا ہونہار اور لائق شاگرد اتنا ظالم اور سنگ دل بن جائے گا اور علم جیسی قوت کا غلط اور ناجائز استعمال کرے گا۔ بیجو بہت بوڑھا اور کم زور ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس سے علم کی یہ توہین نہ دیکھی گئی۔ وہ دہلی شہر کی طرف چل دیا تاکہ گوپال کو سمجھا بجھا کر سیدھے راستے پر لائے۔ وہ پوچھتا پاچھتا شہنشاہ موسیقی گوپال نایک کی حویلی پر پہنچا اور اسے پیغام بھجوایا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ کافی دیر انتظار کے بعد گوپال نے اسے اندر بلایا۔ بیجو پھٹے پُرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ گوپال نے اپنے اُستاد کی آؤ بھگت کرنا تو دُور کی بات، اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا تک نہیں۔

کچھ دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد بیجو نے بڑی محبت سے کہا: ”بیٹا گوپال، تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں تمہارا اُستاد بیجو ہوں اور تم سے ملنے کے لیے اتنی دُور سے پیدل چل کر یہاں آیا ہوں۔“ یہ سننا تھا کہ گوپال غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس وقت اس کے یہاں کئی درباری اور غلام موجود تھے۔ ان کے سامنے وہ اس غریب بوڑھے کو اپنا اُستاد بتا کر اپنی عزت کیسے مٹی میں ملا دیتا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا: ”چپ رہ بوڑھے! تو اور میرا اُستاد! چل بھاگ یہاں سے!“

بیجو نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا شاگرد اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ اس نے کہا: ”گوپال، تجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے پہچان۔ میں تیرا اُستاد بیجو ہوں۔“

گوپال بڑی حقارت سے بولا: ”میں تجھے پہچانوں یا نہ پہچانوں، مگر تو مجھے ضرور پہچان لے۔ میں نے بڑے بڑے اُستادوں کے سر جھکا دیے ہیں۔ تو کس کھیت کی مولی ہے۔ اگر تجھے اپنی اُستادی پر اتنا ہی ناز ہے تو کل جان ہتھیلی پر رکھ کر شاہی دربار میں آ جانا۔ شاید تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے۔“ یہ کہا اور بیجو کو دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔

دوسرے دن بیجو شاہی دربار میں پہنچا اور بادشاہ کو پیغام بھجوایا کہ گوالیار کا ایک گویا شاہی گویّے گوپال نایک سے مقابلے کے لیے آیا ہے۔ بادشاہ نے گوپال کو بلوایا اور مقابلہ شروع ہوا۔ پہلے گوپال نایک نے تان پورے پر ایک راگ چھیڑا۔ راگ کے اثر

سے شاہی محل کے تمام چراغ از خود جل اُٹھے۔ وہ گاتا رہا، گاتا رہا، یہاں تک کہ آس پاس کے جنگلوں سے ہرن بھاگتے ہوئے آئے اور اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ان سب کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور راگ بند کر دیا، تمام ہرن جنگلوں کی طرف بھاگ گئے۔

گوپال نایک نے بڑے گھمنڈ سے کہا: ”بڈھے! دیکھا تو نے میری موسیقی کا کمال؟ اب اگر تجھ میں کچھ دم ہے تو اپنی موسیقی کے ذریعے ان تمام ہرنوں کو واپس بلا اور ان کے گلوں سے ہار اُتار کر میرے حوالے کر دے۔“

بیجو نے مسکرا کر تان پورہ اُٹھایا اور گانا شروع کیا۔ سننے والے مست ہو گئے۔ بجھے ہوئے چراغ پھر سے جل اُٹھے۔ تمام ہرن جنگلوں سے واپس آ گئے۔ بیجو گاتا رہا اور ہرنوں کے گلوں سے مالائیں اُتارتا رہا۔ آخر کار محل کا پختہ فرش اس کے گانے کے اثر سے پگھل گیا۔ بیجو نے اس پگھلے ہوئے فرش پر اپنا تان پورہ پھینک دیا۔ راگ کے رُکتے ہی فرش پھر جم گیا اور تان پورہ اس میں پھنس گیا۔

بیجو نے ہرنوں کی گردنوں سے اُتاری ہوئی مالائیں گوپال کو دیتے ہوئے کہا: ”شاہی گوّیے! میں نے تیری بات پوری کر دی۔ اگر تیری موسیقی میں کچھ اثر ہے تو میرا تان پورہ پتھروں کے اس فرش سے نکال کر مجھے دے دے۔“

گوپال نایک نے اپنا تان پورہ سنبھالا، قسم قسم کے راگ الاپے اور موسیقی کے تمام کمالات دکھائے مگر لاکھ کوششوں کے باوجود وہ فرش کو نہ پگھلا سکا۔ آخر اس نے تان پورہ پھینک کر اپنی ہار مان لی۔

بادشاہ نے بیجو کی فتح کا اعلان کیا اور گوپال کے قتل کا حکم دے دیا۔ گوپال بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور گڑگڑا کر بولا: ”جہاں پناہ! یہ اس بڈھے کے کمال کی نہیں، اس کے فریب کی جیت ہے۔ یہ میرا اُستاد ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ سکھایا، پتھروں کو پگھلانے والا راگ نہیں سکھایا۔ اس نے ایک اچھے اُستاد کا فرض ادا نہیں کیا۔“

بیجو نے کہا: ”نیچ اور کم ظرف! اسی دن کے لیے میں نے اس علم کو تجھ سے پوشیدہ رکھا تھا۔ اگر یہ علم بھی میں تجھے سکھا دیتا تو تیرے ہاتھوں میرا ہی نہیں، اور بہت سے بے گناہوں کا خون ہوتا۔“

گوپال نایک روتا ہوا بیجو کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ گوپال کی جان بخش دی جائے۔ ”اُستاد زندگی دیا کرتا ہے، لیا نہیں کرتا۔ میرا مقصد اسے سیدھے راستے پر لانا تھا۔ اب یہ ایک اچھا انسان بن گیا ہے۔ اسے معاف کر دیجیے۔ اگر آپ سزا دینا ہی چاہتے ہیں تو اس کے بدلے مجھے دیجیے کیوں کہ میں گناہ گار ہوں۔ ایک اُستاد کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں اس کی فطرت پہچاننے کی کوشش کرتا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے ایسے غلط آدمی کے ہاتھوں میں ایسی قوت دے دی۔ میری ہی غلطی کی وجہ سے یہ تمام ظلم ہوئے۔ لہٰذا حضور اس غلطی کی سزا مجھے دیں۔ اصل گناہ گار تو میں ہی ہوں۔“

بادشاہ نے کچھ دیر سوچا، پھر بولا: ”عظیم فن کار بیجو! آپ پتھر کو تو پگھلا سکتے ہیں، مگر انصاف کے اس تخت پر بیٹھے ہوئے شہنشاہ کے دل کو ناانصافی کے لیے نہیں پگھلا سکتے۔ اس بدبخت کو سزا ملنا لازم ہے۔“

بیجو کی منت سماجت کے باوجود بادشاہ نہ مانا اور اس کے حکم سے گوپال نایک کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ ☆☆☆

زبان کا سفر

قفل: عربی زبان میں 'تالا' کے لیے استعمال کیے جانے والے اس لفظ سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ جس شے کو تالا لگا کر بند کر دیا جائے اس کو 'مقفل' کہتے ہیں۔ اسی سے ایک لفظ بنا "قافلہ" بظاہر اس کا تالے سے کوئی تعلق نہیں لیکن غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ قافلے کے افراد ایک دوسرے سے یوں مربوط رہتے ہیں جیسے کوئی شے تالے کے اندر بند ہو۔ 'قفل' سے ہسپانوی زبان میں ایک لفظ بن گیا۔ 'اکیفلر' ACAFELAR

امبر: ہندی زبان کا لفظ ہے۔ مراد ہے ”آسمان“ ویسے اس لفظ کے کچھ اور معانی بھی ہیں مثلاً: چادر، بادل، راجا کی پوشاک۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم جس شے کو ”نیلا آسمان“ کہتے ہیں ”نیلی چھتری“ کا لقب دیتے ہیں (اور بعض افراد، اللہ تعالیٰ کے لیے ”نیلی چھتری والا“ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) تو یہ نیلا آسمان بذات خود کوئی شے نہیں ہے، محض ایک سایہ ہے۔ اب دیکھیے کہ انگریزی میں ”امبرے“ UMBRA 'سایہ' ہی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ انگریزی میں لاطینی سے آیا ہے۔ اس لفظ کے ایک دل چسپ معنی یہ بھی ہیں کہ وہ بن بلایا مہمان جو کسی مدعو مہمان کے ساتھ چلا آئے! (یعنی وہ مدعو مہمان کا سایہ بن جائے!) ”امبرے“ سے مراد چاند کا وہ سایہ بھی ہے جو گرہن کے وقت زمین پر پڑتا ہے۔ اسی لحاظ سے لفظ ”امبریلا“ UMBRALLA بنا لیا گیا، جو بہت معروف لفظ ہے، یعنی ”چھتری“ اب دیکھیے کہ ہندی کے امبر یعنی نیلی چھتری اور امبریلا (جو کسی بھی رنگ کی ہو سکتی ہے!) میں کتنی مماثلت ہے۔ انگریزی میں امبرے سے ایک اور لفظ بنا لیا گیا ہے: ”امبریج“ UMBRAGE اس سے مراد وہ شے ہے جو سایہ بن رہی ہو۔ یہ لفظ خود سایہ کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ اس کے ایک معنی حملہ، جارحیت، حملہ کرنا یا جارحانہ عمل بھی ہیں۔ دراصل سردی کے موسم میں، غسل آفتابی کے دوران میں، اگر بادل کا کوئی ٹکڑا سورج کو چھپا لے تو یہ بادل طبیعت کو ناگوار محسوس ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ اس بادل نے ہمارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا ہے، ہمارے آرام و سکون پر حملہ کیا ہے۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2015ء ہے۔

اگست 2015ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں، محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (سمیعہ توقیر، کراچی)
- انسان پہنچے چاند پر تو ہم کیوں پیچھے رہیں (فاطمہ نور، شیخوپورہ)
- ہم پہ ایسی بھی پڑے گی ہمیں معلوم نہ تھا (حسان خرم، لاہور)
- اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے، پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے (ایمن فاطمہ، ملتان)
- خلا میں جانے لگے خرگوش، ہم ہیں گھروں میں حلقہ بگوش (شاہ زیب حسن، پشاور)

تصاویر صرف اُفقی رخ میں ہی بنائیں۔

محمد زبیر جمشید علی، خانیوال (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

عائشہ چوہدری، فیصل آباد (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

فائزہ رضا، گجرات (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

سعدیہ توقیر، کراچی (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

مشعل اقبال، ٹوبہ ٹیک سنگھ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی: حافظ حبیب اللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ کشف طاہر، لاہور۔ جویریہ یونس، لاہور۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ فائقہ ستار، لاہور۔ حسان نواز خان، اٹک۔ علی نواز خان، اٹک۔ محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سحر امین، گجرات۔ امرتی زاہد، اسلام آباد۔ شائل حسن، لاہور۔ دعا یٰسین، سرگودھا۔ آمنہ اقبال، تلہ گنگ۔ بیجا فاطمہ، تلہ گنگ۔ اذکی آصف، پشاور۔ آمنہ قریشی، اسلام آباد۔ محمد عبداللہ بن ظفر، لاہور کینٹ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ لائبہ عرفان، کراچی۔ علیین کشف، لاہور۔ مانگ بٹ، لاہور۔ فاطمہ فیاض، اذکی احسان، واہ کینٹ۔ محمد اکرام، کراچی۔ صوبیہ سلیم، اسلام آباد۔ عرفان مغل، جہلم۔ بشیر اعوان، خانیوال۔ فریدہ اقبال، پشاور۔ کشف [illegible] آباد۔ آفاق احمد، حیدر آباد۔ جاوید اسلم، ایبٹ آباد۔ وقار صادق، جہلم۔ انور احسان، سعد رفیق، صوابی۔ نسرین بشیر، قصور۔ بشریٰ اعجاز، ایبٹ آباد۔ سلیم بٹ، لیہ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کرائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔